امانت کا بوجھ

مائل خیرآبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امانت کا بوجھ

سوچتے سوچتے میں نہ جانے کس عالم میں پہنچ گئی۔ وہاں نہ آسمان تھا نہ زمین۔ نہ ہوا اور نہ فضا ہی۔ جی ہاں! کچھ بھی نہ تھا۔ آپ تعجب نہ کریں۔ میں واقعی سچ کہتی ہوں۔ اور سنئے، میں اس عالم میں پہنچ کر ''میں'' نہ رہی۔ میں کیسے سمجھاؤں میں کیا ہوکر رہ گئی تھی۔ بس یہ سمجھئے کہ میں صرف ایک روح تھی۔ اور میرا جسم؟ جسم وسم کچھ نہ تھا۔ اب شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کس عالم میں تھی۔ میں اس جگہ کا نقشہ لفظوں میں کھینچنے سے عاجز ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ صرف ایک ''خلا'' تھا جس میں کچھ بھی نہ تھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ میرے اوپر، بہت دور اوپر۔ بہت ہی دور اوپر ایک نیلگوں دھنواں دھنواں، نہیں۔ دھنواں تو کثیف ہوتا ہے۔ وہ تو نہایت لطیف سا کچھ تھا۔ اچھا تو وہ ''لطیف سا کچھ'' دیکھتے دیکھتے میرے اوپر شامیانے کی طرح چھا گیا۔ ''ارے وا!'' میری زبان سے نکلا ''آسمان''!

میں بڑی حیرت میں تھی کہ یہ آسمان آپ سے آپ کیسے بن گیا۔ پھر اسی آسمان میں ایک طرف سے سورج بھی آ گیا۔ اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ۔ پھر اسی آسمان میں ایک طرف سے چاند بھی آ گیا۔ اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ، پھر اسی آسمان میں تارے جگمگانے لگے۔ کہکشاں بھی بن گئی۔

میں حیران حیران یہ سب دیکھ رہی تھی کہ اچانک تلاطم کا شور سنا اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک طرف سے طوفان سا آیا۔ میری آنکھیں جھپک گئیں، چشم زدن میں سمندر اپنی عظیم موجوں کے ساتھ آ موجود ہوا۔ پھر زمین ابھر کر آ گئی اور اس میں پہاڑ، دریا، جنگل اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب آ موجود ہوا۔

''اوہ میرے خدا!'' میں کہاں ہوں؟ یہ میری زبان سے نکلا۔ میں کچھ نہ سمجھی کہ میری

نظروں کے سامنے یہ سب کچھ کیوں آ رہا ہے یا لایا جا رہا ہے۔

شاید آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ ممکن ہے وہ خواب ہو، لیکن میرے ہوش وحواس بالکل بجا تھے۔ میں پڑھنے بیٹھی تھی اور پہنچ گئی کہیں سے کہیں۔

دیکھئے آپ مسکرایئے گا نہیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک نورانی، جمالی اور جلالی مخلوق صفاً صفاً اس طرح استادہ ہوگئی، جیسے وہ کسی عظیم ہستی کے انتظار میں ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیسے جان لیا کہ یہ جمالی اور جلالی نورانی مخلوق ملائکہ ہیں۔

اور پھر؟ آپ بھی کہیں گے کہ یہ سب خواب کی باتیں ہیں، مگر بھئی، میں تو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اچھا خیر۔ آپ کچھ کہیں، میں عرض کروں گی کہ پھر لامتناہی کناروں کا ایک نہایت لطیف اور نورانی تخت آیا اور سارے عالم کے اوپر ٹھہر گیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس تخت پر کون متمکن ہے، میں اسے دیکھ نہ سکی۔ دیکھ کیسے سکتی تھی۔ جب اس کا تخت دیکھنے سے میری آنکھوں میں چکا چوندھ سی ہو جاتی تھی۔ تو صاحب تخت کا نظارہ کرنا میری نظروں کے بس کا نہ تھا۔ ہاں میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ ''کوئی'' سب سے بڑا تھا۔ اور پھر جب میں نے دیکھا آسمان اور آسمان کی ساری چیزوں نے، زمین اور زمین کی ساری چیزوں نے، فضا اور فضا کی ساری چیزوں نے تھرا کر سجدہ کیا تو میں سمجھ گئی کہ یہ تخت دراصل ''عرش'' ہے۔ اور عرش پر اللہ، صاحب ذوالجلال والاکرام تشریف فرما ہے۔ میں نے نہیں، میری روح نے بھی سجدہ کیا۔

میں عرش کو دیکھ رہی تھی۔ میں فرشتوں کو بھی دیکھ رہی تھی۔ آسمان اور زمین اور ساری چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن مجھے حیرت، بے چینی کے ساتھ حیرت تھی کہ اس ساری مخلوق میں ''حضرت انسان'' کہیں نظر نہیں آتے، یہ خیال شاید بے چینی کے ساتھ اس لیے آیا کہ میں اسی جنس سے ہوں۔ پھر میں نے یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا کہ ایسے ایسے بڑوں میں یہ پانچ چھ فیٹ کا انسان کہیں نہ کہیں ہوگا ضرور، مگر ایسی عظیم الجثہ اشیاء کے انبوہ میں نظر ہی کب آئے گا، کہیں کسی پہاڑ کے دامن میں چھپا ہوگا۔ کہیں کسی جنگل کی جھاڑیوں میں بیٹھا ہوگا۔ ایسی ایسی مخلوق میں اس کی حیثیت ہی کیا۔

یہ خیال آتے ہی میں کچھ جھینپ بھی گئی۔ انسان ہوں نہ، مجھے اسی لیے شرم سی محسوس ہوئی۔ اونھ، میں بھی خوب ہوں، کیا کہہ رہی تھی۔ بیچ میں اپنی ضعیف الجثہ ہستی پر منطق جھاڑنے لگی۔ مگر سچی بات سچی ہی ہے۔ مجھے ساری مخلوق کے مقابلے میں انسان کی بے چارگی پر یعنی اپنی جنس پر ترس آ رہا تھا۔

اچانک ایک بجلی سی چمکی۔ بجلی نہیں، بجلی میں تو تڑتڑاہٹ اور کڑک ہوتی ہے۔ یہ جو چمک ہوئی تو اس میں دہشت ناکی نہیں تھی۔ ہاں، اسے یوں کہیے کہ اچانک ایک نور چمکا، اس نور کی چمک سے نہ کسی کی آنکھیں خیرہ ہوئیں اور نہ دل دہلا۔ میں نے دیکھا اور میں نے ہی کیا، آسمان نے اور آسمان کی تمام چیزوں نے، فضا نے اور فضا کی ساری چیزوں نے، زمین نے اور زمین کی ساری چیزوں نے اور ہاں فرشتوں نے بھی دیکھا کہ اس نور سے ایک قلم پیدا ہوا۔ اور اس نے عرش کے نیچے فضا میں جلی حروف میں لکھ دیا: ''اختیارات اور ذمے داری''

''یہ کیا مطلب''؟ میری زبان سے نکلا۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ وہاں موجود تھا ہر ایک بول اٹھا ''کیا مطلب؟'' فرشتے بھی سوالیہ نشان بن کر رہ گئے۔

آواز آئی۔ ''ہم اپنے اختیارات میں سے تم کو کچھ دینا چاہتے ہیں۔''

آواز کیا تھی ایک شاہانہ بخشش اور اکرام کا انداز تھا، ساری مخلوق یہ انداز کرم دیکھ کر سجدے میں گر گئی۔ ''اے ہمارے پیدا کرنے والے! اے ہمارے مہربان مالک! تو بخشش اور فضل والا ہے، جسے جو چاہے بخش دے۔''

ساری مخلوق سجدے میں یہ عرض کر رہی تھی۔ اس کے بعد جب سب سجدے سے اٹھے تو سنا۔

''لیکن ان اختیارات کے ساتھ ان کی ذمے داری بھی ادا کرنی ہوگی۔''

''اے لامتناہی علم و حکمت والے۔'' سب کہنے لگے: ''ذمے داری کا مطلب ہم نہیں سمجھے!''

''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بندوں میں سے کوئی بڑھ کر ہمارے بخشے ہوئے کچھ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے اور پھر بھی ہمارا بندہ بنا رہے۔''

''ورنہ؟''

آپ سے آپ میری زبان سے نکل گیا اور ساری مخلوق بھی یہی لفظ بول گئی، میں نے سنا سب نے عرض کیا۔ ''ورنہ اے ارحم الرحمان!''

''ہمارے بخشے ہوئے اختیارات پا کر اگر ہمارا بندہ، ہمارا بندہ بنا رہے گا تو وہ ہمارا نائب کہلائے گا اور ہم اسے اپنی رضا کے گھر میں رکھیں گے۔''

اچانک سب نے دیکھا، جنت، اپنے بے انتہا بناؤ سنگار اور نعمتوں کے ساتھ سامنے آگئی۔

''داتا! یہ ہمیں دیدے۔'' سب نے کہا۔

''پوری بات سنو۔ لیکن اختیار پا کر جو بندہ من مانی کرے گا، ہمارا بندہ بن کر نہ رہے گا تو اس کی سزا بھی دیکھ لو۔''

اچانک سب نے دیکھا۔ جہنم تمام اپنی ہولناکیوں اور عذابوں کے ساتھ سامنے آگئی۔

''اے سب سے بڑے مہربان، یہ ہمیں نہیں چاہیے......... ''سب نے کہا اور یہ کہہ کر سجدے میں گر گئے، فضا ساکت ہوگئی۔ میں سوچنے لگی۔ اب کیا ہوگا۔ اللہ رب العزت کا حکم، کیا اس کا حکم یونہی رہ جائے گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اللہ کا حکم عملی جامہ ضرور پہنے گا۔ مگر میں دیکھ رہی تھی کہ ساری کائنات کو جیسے جہنم کے عذابوں نے سونگھ لیا ہو۔ کوئی ہمت ہی نہیں کر رہا تھا۔

''ہے کوئی ہمارا بندہ!''

اب بھی سب چپ تھے۔ اچانک ایک طرف حرکت سی پیدا ہوئی۔ سب کے پیچھے سے ایک سایہ جنبش کرتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا، یہ تو میری جنس کا پانچ ساڑھے پانچ فیٹ کا انسان ہے۔ میں مسکرائی۔ آسمان اور زمین کی ساری چیزوں نے اس کا مذاق اڑایا۔

''اہا، آپ کو دیکھیے، مینڈکی بھی چلی مداروں کو۔'' لیکن یہی ضعیف الجثہ انسان ساری بھیڑ کو چیرتا آگے بڑھا۔ پھر نہ جانے کیسے اوپر اٹھا۔ اور اس نے ان نورانی لفظوں کو آنکھوں سے لگالیا۔

''کیسا احمق ہے یہ انسان، کیسا جلد باز ہے یہ آدمی۔ کیسا جاہل ہے یہ شخص۔ ذمے داری کا بوجھ اٹھا سکے گا؟''

ساری کائنات انسان پر ہنس دی۔ لیکن۔ وہی انسان جب ''اختیارات اور ذمے داری'' کے نورانی الفاظ چوم کر اپنی جگہ آرہا تھا تو سب نے دیکھا آسمانوں کی ساری وسعتوں اور زمین کی ساری گنجائشوں اور فضاؤں کی تمام پہنائیوں کا بوجھ اس کے سر پر رکھا تھا، کائنات کی زبان بند ہو کر رہ گئی۔ میں اپنی جگہ حیرت زدہ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی جنس کے اس انسان پر رحم آنے لگا۔

پھر نہ جانے کیسے مجھے خیال آیا کہ یہ شخص (مرد) میرے تعاون (عورت) کے بغیر اس بوجھ کو لے کر نہ چل سکے گا۔ اس جذبۂ تعاون نے میرے اندر اس کی محبت اور ہمدردی پیدا کردی۔ پھر میرا خیال واقعی ٹھیک معلوم ہونے لگا۔ انسان اس بوجھ کو لیے اپنی جگہ ہنوز نہیں پہنچا تھا کہ درمیان راہ ہی میں اس کے پیر کانپنے لگے، مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں جذبۂ تعاون کے مارے بے قرار ہوگئی اور میں نے بڑھ کر اپنا کندھا لگا دیا۔

مرد میری مدد پا کر قوی اور توانا ہو گیا۔ اب وہ اس طرح جا رہا تھا جیسے وہ کوئی پھول اٹھائے لیے جا رہا ہو۔

''اری مریم! اتنی دیر ہو گئی، تو نے ذرا سے شعر کا مطلب نہ لکھا۔'' بھائی جان نے جو مجھے ڈانٹا تو یکدم چونک پڑی۔

''لکھتی ہوں بھیا!'' اور یہ کہہ کر میں نے جلدی جلدی لکھا۔

''دراصل میر تقی میر نے یہ خیال ایک فارسی شعر سے لیا ہے جو یوں ہے:

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

میر کو فارسی کا یہ شعر پسند آ گیا۔ چونکہ شاعر بے بدل تھے۔ اس لیے اس طرح اردو کے سانچے میں ڈھالا کہ پتہ نہیں چلتا کہ ترجمہ ہے بالکل طبع زاد، برجستہ اور فی البدیہہ معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس بوجھ کر دیکھ کر ساری کائنات نے کانوں پر ہاتھ رکھا کہ ہم سے نہ اٹھے گا۔

میر صاحب فرماتے ہیں کہ ۔

تم پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

جس بوجھ کا ذکر اس شعر میں ہے، اس سے مطلب وہی بار امانت ہے جس کا ذکر فارسی شعر میں ہے۔ یعنی اختیارات جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بخشے اور وہ ذمے داری جو اس کے سر ڈالی گئی ہے مذہبی سیاست کی اصطلاح میں اسی کا نام ''خلافت'' ہے۔ قرآن میں ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ اس سے میری اس وضاحت کی تائید ہوتی ہے۔ منشا یہ ہے کہ انسان اللہ کی بخشی ہوئی چیزوں کو اللہ کے دیے ہوئے اختیارات کے اندر استعمال کرے۔ بے اعتدالی نہ کرے۔ من مانی نہ کرے۔ اگر اختیار پا کر بندہ، بندہ ہی بنا رہے گا تو اللہ جنت دے گا۔ اور اگر اختیار پا کر گھمنڈ میں آ گیا اور خود کی خدائی جتانے لگا تو جہنم کا کندہ بنے گا۔

جلدی جلدی لکھ کر میں نے بھائی جان کو شعر کا مطلب دکھایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ انھوں نے اپنی کلائی کی گھڑی کھول کر میری کلائی میں باندھ دی۔

علی ملّا

''ابا! مجھے دھوکا دیا گیا۔ آپ فوراً تشریف لائیں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا'' ---
علیم اللہ (اور آپ کا علی ملّا)

قبل اس کے کہ میں اپنے علی ملا کے اس خط کے پیچھے جو کہانی ہے وہ آپ کو سناؤں۔ تمہید کے طور پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں علی ملا کا باپ نہیں اس کا بڑا بھائی ہوں۔ وہ مجھ سے چوبیس پچیس سال چھوٹا ہے۔ علی ملا کی پیدائش کے بعد والدین دو برس کے اندر آگے پیچھے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اور پھر اس بچے کی پرورش کی ذمے داری مجھ پر اور میری بیوی پر آپڑی تھی۔ میری بیوی نے اسے دودھ بھی پلایا۔ پھر جب وہ ذرا بڑا ہوا تو میرے اپنے بچوں کی دیکھا دیکھی یا دیکھا سنی، علی ملا مجھے ابا اور میری بیوی کو امی کہنے لگا۔ اس کے اس کہنے کا اثر ہم میاں بیوی پر نفسیاتی طور پر پڑا کہ ہمیں اس سے ایسی ہی محبت ہو گئی، جیسی محبت اپنے بچوں سے ہوتی ہے۔ علیم اللہ، اس کا نام والدین نے رکھا۔ لیکن بچپن سے اس کی اٹھان کچھ اس طرح کی تھی کہ اگر اسے صحیح تعلیم مل جاتی اور وہ کسی دار العلوم کی ہوا پا جاتا تو بہترین عالم ہوتا۔ لیکن میرے چھوٹے سے گاؤں میں پہلے کچھ مسجد کی تعلیم حاصل کرتا رہا اس کے بعد پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں سے فارغ ہوا تو پاس کے قصبے میں ہائی اسکول کیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم دلائیں۔ لیکن جب وہ ہائی اسکول کر کے گھر آیا تو اچانک بیمار ہو گیا۔ پھر جب اچھا ہوا تو اسے دھن سوار ہوئی کہ گاؤں میں اپنا ایک مدرسہ قائم کرے گا، جس میں ایسی تعلیم ہو گی کہ جسے حاصل کرنے کے بعد ایک طالب علم دین و دنیا دونوں کے کام کا بنے گا۔ ہم سب نے بہت سمجھایا کہ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن وہ چار چھ بچوں اور بچیوں کو لے کر گھر کے باہری کمرے میں بیٹھ گیا اور انہیں پڑھانے لگا۔

میں نے جو کچھ عرض کیا اس سے میری مراد یہ ہے کہ میرے علی ملا کی کہانی پڑھنے والا یہ سمجھ لے کہ وہ کیسا نیک لڑکا تھا۔

علی ملا صرف یہی نہیں کہ نیک تھا۔ وہ جسمانی طور پر بڑی اچھی صحت کا مالک اور حسین و جمیل نوجوان تھا۔ اپنے حسن و جمال، صحت اور نیکی کی بدولت وہ تھوڑے ہی دنوں میں دور و نزدیک مشہور ہوگیا۔ اب اس پر لڑکی والوں کی نظریں پڑنے لگیں۔ بند بند لفظوں میں مجھ سے بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی لڑکیوں کے بارے میں کہا لیکن میں نے مرزا شہاب علی بیگ کی پیش کش کو قبول کرلیا۔ مرزا صاحب پوتڑوں کے رئیس اور ایک بہت بڑی جائداد کے مالک تھے۔ ان کے کئی لڑکے اور صرف ایک لڑکی تھی۔ اس لڑکی کے متعلق انھوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ کہلوایا۔ ان کے دوست نے دبے لفظوں میں یہ بھی اشارہ کردیا کہ اگر رشتہ ہوجائے تو علیم اللہ نے جیسا مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے ویسا مدرسہ جلد وجود میں آسکتا ہے۔ کیونکہ مرزا صاحب اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ لڑکی کے نام کردیں گے۔

میں نے اس سلسلے میں اپنی بیوی کے ذریعہ علی ملا کا عندیہ معلوم کیا تو اس نے شرما کر کہا ''امی! جہاں چاہو کردو۔ میں تو آپ کا بیٹا ہوں۔'' اس کے اس جواب کے بعد ایک ہفتہ کے اندر شادی ہوگئی۔ واقعی مرزا صاحب نے نقدی، زیورات، دیگر سامان کے علاوہ تیس بیگہ زمین بھی لڑکی کو دی اور اپنے باغ ''لکھ پیڑا'' کے نفع میں ۱/۴ کا حصہ بھی لکھ دیا۔ اس ۱/۴ کے منافع کا حساب لگایا گیا تو دو ہزار ڈھائی ہزار، تین ہزار (جیسا موسم ہو) ہوتا تھا۔ یہ رقم اتنی تھی کہ علی ملا اپنا مدرسہ ابتدا میں بڑی خوبی سے چلا سکتا تھا۔

اس نے کیا بھی یہی۔ شادی کے بعد ہی ایک ماہ کے اندر اندر جب باغ نیلام ہوا تو چوتھ کی رقم میں سے ۱/۴ لڑکی کے ہاتھ میں رکھ دیا گیا۔ اور لڑکی نے اپنے شوہر علی ملا کو دے دیا۔ اور علیم اللہ نے دوسرے ہی مہینے اپنی مدد کے لیے سو روپے ماہانہ پر ایک اچھے مولوی کو رکھ لیا، دینیات کی تعلیم اس کے سپرد کی اور خود دنیوی تعلیم دینے لگا۔

دوسرے مہینے جب اسے مدرسے کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو تیسرے مہینے اس نے وہ خط لکھا، جس کا ایک حصہ میں نے اوپر نقل کیا۔ خط پڑھ کر میں سوچنے لگا۔ علی ملا کو کس نے دھوکا دیا۔ کس بارے میں دھوکا دیا، کیوں دھوکا دیا، کیا میری عدم موجودگی میں کسی کے ساتھ اس

نے روزگار میں شرکت کی؟ اور شریک نے روپیہ مارلیا۔ کیا مولوی دھوکا دے کر چلا گیا۔ کیا اس کی امی (یعنی میری بیوی) نے کچھ ڈانٹ پھٹکار دیا وغیرہ۔

اس طرح کے سوالات دل ہی دل میں کرتا ہوا میں لکھنؤ سے بھاگم بھاگ اپنے گاؤں پہنچا۔ راستے میں کچھ لوگ ملے ان سے خیریت پوچھی سب نے مجھے ہر طرح کی عافیت کا یقین دلایا۔ گاؤں میں آیا تو یہاں کی فضا پرامن پائی۔ اس وقت علی ملا اپنے مدرسے میں تھا میں سیدھا گھر پہنچا۔ بیوی سے حال پوچھا تو جیسے کوہ آتش فشاں میں پانی پڑ جائے اور وہ بھڑک اٹھے اور پھٹ جائے۔ عمر میں پہلی بار میری بیوی اور علی ملا کی امی مجھ پر برس پڑیں۔

''نہ ٹھیک سے دیکھا، نہ کچھ جانچ پڑتال کی اور لڑکے کی گردن دھن و دولت کے شکنجوں میں کس دی۔ میں کہتی تھی کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ مت کرو، مگر تم ہو کہ کسی کی سنتے کب ہو۔ اب لو پیٹو اپنا سر!''

بیوی دیر تک اس طرح جھینکتی اور مجھے ناسمجھ کہہ کر سخت سست کہتی رہی۔ میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی گردن غصے میں کبھی پھول جاتی، ماتھے پر شکنیں زیادہ ہو جاتیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا اور کبھی سنجیدہ۔ ایک بار اس نے ذرا تامل کیا تو میں نے پوچھا۔

''تم نے غصہ تو اتنا کر لیا لیکن یہ نہیں معلوم ہوا کہ بات کیا ہے، عشرت کہاں ہے؟''

''وہ اپنے میکے میں ہے۔ تیسرے چالے کے بعد علی ملا اسے لینے نہیں گیا اور مجھے بھی سختی کے ساتھ روک دیا۔''

''کیوں؟''

میرے کیوں؟ کہنے پر بیوی نے مجھے اس طرح گھورا کہ میں گھبرا گیا۔ اس نے کہا:

''شادی کے بعد تم نے کچھ محسوس کیا تھا کہ نہیں کہ علی ملا ضرورت سے زیادہ سنجیدہ رہنے لگا تھا۔''

''ہاں ہاں! وہ شرمیلا تو ہے ہی۔ نیک لڑکا شادی کے بعد ایسا ہی ہو جاتا ہے۔''

''تمہاری شرم جائے بھاڑ میں، یہ اس کی شرم نہیں تھی، ایک غم تھا، جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''غم، غم کیسا؟''

'' مجھے تو معلوم نہیں تھا۔ ایک دن نادان مجھ سے بولا '' امی ! تمہارے بدن سے ایک طرح کی خوشبو پھوٹتی ہے لیکن عشرت ...... ''

'' ہٹ، بے غیرت ! شادی ہوتے ہی بے شرم بن گیا۔'' اور پھر میں نے بری طرح اسے جھڑک دیا۔

'' میں تیری ماں ہوں، بھابی نہیں !'' علی ملا آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور اداس ہوکر میرے پاس سے چلا گیا۔

'' عشرت میں کیا بات دیکھی اس نے ۔ اچھی خاصی گوری چٹی لڑکی ہے ۔ مجھے تو اب بھی یہ معلوم ہے کہ وہ بڑی اچھی عادت کی ہے۔ نماز روزے کی پابند ہونے سے صاف ستھرا پن بھی اس میں ہے۔ مزید یہ کہ بڑے باپ کی بیٹی ہے، عطر وغیرہ بھی استعمال کرتی ہے، بے زبان بھی ہے۔'' '' یہ سب کچھ ہے مگر۔''

'' ہاں ہاں بتاؤ، چپ کیوں ہوگئیں؟''

'' تم نے دیکھا نہیں کہ وہ '' نک بیٹھی'' ہے۔

'' تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ بہت سی لڑکیوں کی ناک پر پہیہ پھرا ہوتا ہے۔''

'' بس یہی وہ راز ہے جس کا پتہ تم نے نہیں لگایا اور ایک ہفتہ میں بات پکی کر کے علی ملا کے گلے میں بدبو کا توبڑا لٹکا دیا۔''

'' یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

'' پوری بات سنو، علی ملا کے دوست عباس کی بیوی نے بتایا۔ اس نے عباس سے کہا اور عباس نے اپنی بیوی سے ۔ اس کی بیوی نے مجھ سے ۔

'' کیا؟''

'' علی ملا نے عباس سے ایک دن کہا، یار ! میری بیوی اپنے پھول سے گالوں کا بوسہ لینے نہیں دیتی ۔ اور جب میں اس کے پاس ہوتا ہوں تو وہ اپنا رخ مڑا مڑا سا رکھتی ہے۔ عباس نے جواب دیا کہ وہ صحت کے اصولوں پر عمل کر رہی ہوگی۔ ڈاکٹروں نے منع کیا ہے کہ ناک آمنے سامنے نہیں ہونا چاہیے تا کہ ایک کی سانس سے دوسرے کو نقصان نہ پہونچے۔''

پہلے تو علی ملا بھی یہی سمجھا، لیکن پھر جب اسے معلوم ہوا کہ بات کچھ اور ہے تو مجھ سے

کہنے لگا۔ ''امی!'' اور چپ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ وہ چپ کھڑا رہا۔ میں نے کہا ''اچھا، جاتی ہوں۔ عشرت کو لے آؤں گی۔ تم کہیں جانا نہیں۔''

''نہ نہ امی!'' وہ گھبرا کر کہنے لگا ''اب عشرت کو مت لانا۔''

''کیوں''؟ میں نے پوچھا۔ بڑے ادب سے کہنے لگا۔ ''امی! میری بے غیرتی معاف فرمایئے گا۔ میں آپ سے نہ کہوں تو کس کے سامنے دکھڑا روؤں۔ عشرت کو نطف الانف کی بیماری ہے۔ یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اس بیماری سے بچنا چاہیے''۔

میں نے نطف الانف کا مطلب پوچھا تو کہنے لگا کہ یہ ناک کی بیماریوں میں سے ایک ابتدائی روگ ہے۔ اس کے پیدا ہونے کے مختلف اسباب ہیں۔ عشرت کو یہ روگ اس کی بارہ برس کی عمر سے لگا ہے۔

''کیسے؟'' میں نے علی ملا سے پوچھا۔ اس نے کہا ''عشرت ایک دن لکھ پیڑا باغ کی سیر کو گئی تھی۔ وہاں باغ کے پکے تالاب میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہائی۔ ایک چھوٹی سی جونک اس کی ناک میں چلی گئی۔ اسے پتہ نہ چلا۔ کچھ دنوں کے بعد دن میں دو دو تین تین بار اس کی ناک سے خون آنے لگا۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ لیکن کوئی ڈاکٹر تشخیص نہ کر سکا۔ تو ایک عطائی نے سفوف ''ناس'' ڈھیر سا سونگھا دیا۔ ناس سونگھتے ہی عشرت کو چھینک آئی اور ایک موٹی سی جونک اس کی ناک سے زمین پر آ گری اور خون اس طرح عشرت کی ناک سے بہنے لگا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اب اس کا علاج ہوا، خون تھم گیا۔ لیکن سانس سے بدبو آنے کا روگ لگ گیا۔ لوگوں نے مجھے یہ کہہ کر ڈرا دیا ہے کہ اگر اس کے قریب رہا تو بیماری لگ جانے کا خطرہ ہے اور یہ بھی کہ اگر آگے چل کر بیماری پھر عود کر آئی تو ناک پھول بھی سکتی ہے۔ ناک کے غدود بڑھ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ''۔

اب تم ہی بتاؤ۔ تم نے دولت دیکھ کر بڑا گھر دیکھ کر کچھ بھی کھلی آنکھوں سے نہ دیکھا نہ کسی سے پوچھا۔ کھڑی سواری بیاہ لائے۔ اب تو، وہ کہہ رہا ہے کہ عشرت کی اسے ضرورت نہیں ہے۔

''او......ں و......ہوں!'' میں نے ایک لمبی سانس لی، سر جھکا کر سوچنے لگا۔ کیا کرنا چاہیے؟ دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو اٹھا۔

''کہاں چلے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''عشرت کو لینے۔''

''مگر سنئے تو، دیکھئے ناسمجھی کی بات نہ کیجئے سنئے تو۔ ذرا!''

میں نے سنی ان سنی کر دی۔ مرزا جی کے یہاں پہونچا۔ انھوں نے بڑی عزت سے استقبال کیا۔ خیریت پوچھی۔ تواضع میں تکلف سے کام لیا۔ پھر اچانک آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا کہ اب کی بار عشرت کو میں لے جاؤں گا۔

''ماشاء اللہ۔'' علی ملا کا بڑا سالا مرزا سہراب بیگ مسکرا دیا۔ سب ہنسنے لگے۔ میں عشرت کو لے کر گھر آیا۔ یہاں علی ملا اپنے مدرسے سے آچکا تھا۔ اس کی موجودگی میں، میں نے بیماری کا سارا قصہ عشرت کے سامنے دہرا دیا۔ عشرت بڑی سیدھی اور بھولی لڑکی تھی وہ اعتراف کرتی رہی۔ اس نے بتایا کہ اسی روگ کی وجہ سے عطر کا زیادہ استعمال کرتی ہے۔

میں نے اس سے علی ملا کے اس خوف کا حال بتایا کہ یہ روگ شوہر کو بھی ہو سکتا ہے۔ اور اسی خوف سے وہ تم سے دور دور رہتا ہے۔

''ہاں مجھے معلوم ہے، ان کی نفرت بجا ہے۔''

''تو پھر کیا ہو؟''

اس نے عرض کیا ''ابا! میری گزارش ہے کہ آپ نے جس اعزاز کے ساتھ مجھے اپنے دولت خانہ میں پناہ دی ہے۔ اسی طرح میں پناہ کی درخواست کرتی ہوں۔ اگر یہ (اس نے علی ملا کی طرف اشارہ کیا) مجھے طلاق دے دیں تو حق بجانب ہوں گے، واقعی آپ صاحبان کو دھوکے میں رکھا گیا۔ میں نے اپنی ایک سہیلی سے کہلوایا بھی کہ میرے اس روگ کو بتا دیا جائے مگر میرے والدین اور بھائیوں نے ڈانٹ دیا۔ ان کو غرہ ہے کہ دولت سے یہ بیماری اگر نہیں مرتی تو داماد ضرور مارا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ دولت زیادہ دنوں تک میرا ساتھ نہ دے سکے گی۔ آخر وہی ہوا لیکن میں ایک خطرے سے ان کو آگاہ کر دوں، اگر مجھے طلاق ہو گئی تو میرے بھائی ''ان کو'' زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ مجھے اس گھر میں پڑا رہنے دیں اور آپ ان کی دوسری شادی کر دیں۔ میں اس نئی آنے والی کو اپنی جائداد میں سے نصف ہبہ کر دوں گی۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہوگا کہ میں کسی کی بیوی ہوں۔ رہے میرے جذبات تو......؟''

عشرت کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہمارے گھر میں یہ اس کی پہلی

آواز تھی جو سنی گئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یہ سب کہنے کے لیے تقریر تیار کر چکی اور منصوبہ بنا چکی تھی۔ اس کی اس صاف گوئی، صداقت، شرافت اور سوجھ بوجھ اور پھر رونے سے ہم سب متاثر ہو گئے۔ آنسو ہم سب کی آنکھوں میں بھی آ گئے۔ میں نے علی ملا سے پوچھا، اب کہیے کیا فرماتے ہیں۔

علی ملا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ پھر مجھے اپنی بیوی سے معلوم ہوا کہ وہ نہ طلاق دے گا، نہ دوسری شادی کرے گا اور نہ عشرت کے پاس جائے گا۔

علی ملا کی اس حماقت سے ہم سب پریشان ہو گئے۔ لیکن یہ اس کی حماقت نہ تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اگر عشرت کو اس نے کسی قسم کی تکلیف دی تو زمین میں زندہ دفن کرا دیا جائے گا۔ عباس نے اسے بتایا تھا کہ بھئی بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے مگ سودا مہنگا پڑے گا۔

میں نے یہ خطرہ محسوس کر کے عشرت سے مشورہ کیا تو اس نے کہا ''ہاں، یہ میں نے بھی سنا ہے۔'' پھر ایک آہ بھر کر کہنے لگی ''کاش! میرے گھر والے میرے شوہر کو دوسری بیوی کر لینے پر راضی ہو جائیں، میں عشرت کو لے کر اس کے باپ کے پاس گیا ساری باتیں دہرائیں، افسوس صد افسوس! عشرت کے گھر کے لوگ یہ سنتے ہی برہم ہو گئے، وہ عشرت کے کہنے پر بھی نرم نہ ہوئے۔ پھر کیا ہوا؟

یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔ ایک ایسے نوجوان کی جو بڑا نیک تھا اور پھر دھیرے دھیرے کیا بنتا چلا گیا۔

کچھ دنوں تک علی ملا فطرت سے جنگ کرتا اور خواہشات کو دباتا رہا۔ اس نے خواہشات کو مارنے کی کیا کیا تدبیریں سوچیں، سب تو مجھے معلوم نہیں۔ ہاں ایک دن حکیم عبدالواسع صاحب میرے پاس ایک خط لے کر آئے۔ مجھ سے کہا پڑھیے، یہ خط علیم اللہ کا لکھا تھا۔

''حکیم صاحب! کیا کوئی ایسا نسخہ بھی ہے کہ جس کے استعمال سے قوت باہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔''

میں نے خط پڑھ کر حکیم صاحب کو دے دیا۔ انھوں نے قصہ پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ حکیم صاحب نے سختی سے جواب لکھا کہ خبردار! ایسی کوئی دوا کبھی استعمال نہ کرنا۔ یہی وہ قوت ہے جس کی بدولت انسان میں عزم، حوصلہ، انسانیت اور کیا کیا ہے۔ میں نے بھی ایک خط لکھا اور حکیم صاحب کو دے کر کہا کہ لفافے میں یہ بھی رکھ دیجئے گا۔

مجھے بعد میں احساس ہوا کہ نفسیاتی اعتبار سے علی ملا کو یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے ''ابا'' اس کے احساسات جانتے بوجھتے ہیں۔ میری بیوی نے مجھے لکھا کہ اب کچھ کچھ وہ چڑ چڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسے مدرسے سے دلچسپی نہیں رہی، پھر معلوم ہوا کہ اس نے نماز چھوڑ دی۔ اور پھر جب میں گھر گیا تو دیکھا کہ اس کی داڑھی منڈی ہوئی ہے۔ میں نے حال پوچھا تو پہلی مرتبہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا، میں یہ دین داری لے کر کیا چاٹو ں۔ ظہور کو دیکھیے، اول نمبر کا بدمعاش ہے لیکن کس مزے سے زندگی گزار رہا ہے۔ کیسی اچھی اسے بیوی ملی ہے۔ مجھ میں آپ نے کیا برائی دیکھی، میں نے کب خدا سے بغاوت کی، لیکن خدا نے مجھے کس بات کا بدلہ دیا۔ اور آخر میں یہ مصرعہ یوں پڑھ دیا۔

شامت اعمال ماصورت بیوی گرفت

میں سمجھ گیا کہ اب علی ملا بغاوت پر آمادہ ہے۔ خدا کے خوف کے بدلے اس کے دل میں ایک غم اور غصہ ہے اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ خدا نے اسے اس جال میں پھنسا دیا۔ میں عشرت کو لے کر سیدھا مرزا صاحب کی خدمت میں پھر گیا، میں نے اور عشرت نے مل کر درخواست کی کہ ہنسی خوشی علی ملا کو دوسری بیوی کر لینے دیں۔ لیکن چنگیز خان کی اولاد نے صاف کہہ دیا کہ ہم اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ میں عشرت کو لے کر واپس چلا آیا، اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنی جگہ لکھنو آ گیا۔

لکھنو سے میں پورے تین ماہ تک گھر نہیں گیا۔ تین ماہ کے بعد گھر سے تار آتا ہے کہ فوراً آئیے۔ میں گھبرا کر بھاگا، گھر گیا تو معلوم ہوا کہ علی ملا عشرت کی خالہ زاد بہن نزاکت جہاں کو بھگا کر لے گیا، اور نزاکت جہاں اپنے ساتھ اپنا سارا زیور لے گئی۔

''میں تو جانتا تھا یہی ہوگا۔ اب میں کیا کروں!'' میں نے بیوی سے کہا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ''آہ میرا علی ملا!'' میں نے عشرت سے کہا ''غنیمت ہے اب بھی تمہارے بھائی بند دوسری شادی کر لینے دیں ورنہ علی ملا اب انسان نہیں رہ سکے گا۔''

عشرت نے میری تائید کی اور ہم دونوں پھر مرزا صاحب کے پاس گئے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی برہم ہو گئے۔ ''دور ہو، بدمعاشو! میری نظروں سے۔'' اور انھوں نے پھاٹک بند کر لیا۔ عشرت نے کہا چلیے، جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

اور قسمت کا لکھا یوں سامنے آیا کہ کسی نے بتایا، علی ملا آج کل ممبئی میں ہے۔ نزاکت جو زیور ساتھ لے گئی تھی۔ وہ سب ختم ہو گیا تو علی ملا نے نزاکت کو پانچ سو روپے میں بیچ دیا۔ اور اب وہ اوباشوں کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

میں نے پتہ پوچھا۔ پتہ معلوم ہونے پر میں نے علی ملا کو خط لکھا کہ اب وہ مرزا صاحب کی دسترس سے دور ہے۔ وہیں عشرت کو بلا لے اور وہیں اپنی مرضی سے دوسری شادی کر لے۔ خرچ کی ساری ذمہ داری عشرت پر۔

اس خط کا جو جواب آیا وہ عبرت حاصل کرنے والوں کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ علی ملا نے لکھا۔ ابا جان! مرزا صاحب سے فرما دیجئے کہ اب میں روز ایک شادی کرتا ہوں اور گھنٹہ دو گھنٹہ بعد طلاق دیتا ہوں۔ اس شادی اور طلاق میں میرے صرف دس روپے خرچ ہوتے ہیں اب فرمایئے جسے روز نیا مال ملے وہ پرانا کیوں تلاش کرے۔ آخر میں اس نے یہ شعر لکھا۔

زن نو کن اے دوست در نو بہار — کہ تقویم پارینہ ناید بکار

یہ علی ملا میرا وہی بھائی تھا جو کبھی مجھ سے اپنی بیوی کا حال بتانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اور اب یہی میرا وہ علی ملا تھا کہ اس بے باکی سے اس نے یہ سب لکھ دیا۔

دنیا کھلی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی ہے۔ لیکن علی ملا کو کچھ نہیں کہتی۔ لیکن اسی دنیا کے سامنے جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ علی ملا کو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کر لینے دو تو دنیا کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور اس نے غصہ ناک ہو کر کہا "یہ پہلی بیوی پر صریحا ظلم ہے۔" فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اے سمجھ والو! کچھ تو عبرت پکڑو۔

ردّ عمل

ماہ نامہ ''سدھار'' کے مضمون پڑھ کر اس کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ میں نے اپنی ماں کا کچھ بھی حق ادا نہ کیا۔ اس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ اب وہ اپنا رنگ ڈھنگ بدلے گی۔ اور اس سے جہاں تک ہو سکے گا اپنی ماں، بہنوں، بھائیوں کے سارے حقوق ادا کر سکے گی۔ سب کی خدمت کرے گی۔ اس نے سینما دیکھنے اور غلط قسم کے گانے سننے سے توبہ کی اور جب اس دن اس کی ماں نے اسے گھر میں دل چسپی لیتے اور گھر والوں کی خدمت کرتے دیکھا تو بلائیں لے لے کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ ماں کی دعائیں پا کر وہ اتنا خوش ہوئی کہ وہ اتنا خوش کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ماں کی دعاؤں کے بول سن کر اسے ایسا لطف آیا کہ اتنا لطف اسے اپنی سہیلیوں کی چہلوں اور ریڈیو کے گانوں میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے ماں سے ماہ نامہ ''سدھار'' کی تعریف کی اور ماں نے جھٹ دس روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے تا کہ وہ سالانہ چندہ بھیج کر مستقل خریدار بن جائے۔ سکینہ نے اسی وقت چندہ بھیج دیا، ماہ بماہ ماہ نامہ ''سدھار'' اس کے نام آنے لگا اور وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جو کچھ پڑھتی اس پر عمل کرتی اور اس طرح اس کی اچھی خاصی تربیت ہونے لگی۔

اس نے ایک کام اور کیا۔ اس نے ماہ نامہ ''سدھار'' کے ایڈیٹر ''ادیب کامل'' سے خط و کتابت بھی شروع کر دی۔ ماہ نامہ کی جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی وہ تفصیل سے اس کا جواب منگاتی۔ ایڈیٹر بڑی فراخ دلی سے اس کے سوالوں کا جواب دیتا اور اپنے جوابات سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا صلہ سکینہ یہ دیتی کہ ہر ماہ دو ایک خریدار ''سدھار'' کے لیے فراہم کرتی۔ اسے ماہ نامہ ''سدھار'' سے ایک تعلق پیدا ہو گیا۔ اس تعلق سے وہ ''ادیب کامل'' کا

بڑا احترام کرنے لگی۔ غائبانہ احترام۔ اس کا خیال تھا کہ ''ادیب کامل'' کوئی تجربہ کار اور سن رسیدہ شخص ہے۔ وہ اسے چچا کہہ کر اپنے خطوط میں مخاطب کرتی، حالانکہ دوسری طرف وہی گھسا پٹا ''محترمہ بہن! السلام علیکم ورحمۃ اللہ!'' لکھا ہوا آتا۔ سکینہ اسے دفتری القاب و آداب سمجھتی۔ وہ چاہتی تھی اس کا یہ چچا متانت اور سنجیدگی کے علاوہ کچھ بے تکلفانہ انداز اختیار کرے۔ مگر وہ اپنے اس خیال اور اس چاہ کو خطوط میں نہ لکھ سکی۔ اور اس طرح مہینے گزر گئے۔ ایک بار اس نے لکھا کہ چچا میاں! آپ کا اصل نام کیا ہے، اور آپ کس شہر کے رہنے والے ہیں۔ اس کا جواب ادھر سے گول مول ہی آیا۔ سکینہ برابر اس کھوج میں لگی رہی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ ماہ نامہ ''سدھار'' کا ایڈیٹر اسی شہر کا رہنے والا ہے۔ اپنا رسالہ وہ یہیں مرتب کرتا ہے۔ صرف چھپوانے اور پوسٹ کرنے کے لیے مہینے میں ایک بار وہ دہلی جاتا ہے۔ ایک ہفتہ وہاں رہ کر واپس آتا ہے۔ دفتری کارروائی کے لیے دہلی میں اس نے ایک کلرک رکھ لیا ہے۔

اور پھر اس نے پتہ لگا ہی لیا کہ ادیب کامل صاحب کا دولت خانہ کس محلے میں ہے۔ پھر ایک دن اس نے ماں سے اجازت لی اور اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر ماہ نامہ ''سدھار'' کے ایڈیٹر جناب ادیب کامل صاحب سے ملنے چل دی۔ محلے میں پہنچ کر بڑی آسانی سے ایڈیٹر صاحب کا گھر مل گیا۔ صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے صدر دروازے میں کسی جھجک کے بغیر قدم رکھ دیا۔ داہنی طرف اس نے ایک کمرہ دیکھا جس میں چند کرسیاں، میز اور ایک الماری میں کتابیں رکھی نظر آئیں۔ کمرہ باہر سے بند اور اندر سے کھلا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ اندر ایک کمرے سے کھانسنے کی آواز آئی۔ وہ اسی کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کمرہ میں ایک بوڑھی عورت کو دیکھا۔ وہ بیمار تھی۔ سکینہ سلام کر کے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اپنا تعارف کرایا اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

بوڑھی عورت نے باتیں کرتے کرتے اپنے بیٹے کا شکوہ شروع کر دیا کہ وہ اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ دوا دارو بھی ٹھیک سے نہیں لاتا۔ بس اپنے آرام سے آرام ہے اسے۔ ہاں دوستوں پر خرچ کرتا ہے۔

یہ سن کر سکینہ کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو پیسے دے کر بازار بھیجا اور کہہ دیا کہ

حکیم جان بخش صاحب کے یہاں سے کھانسی کی دوا لے آئے۔ اس نے بوڑھی عورت کا بستر، تکیہ اور فرش صاف کر کے کوڑا کرکٹ الگ رکھ دیا۔ بوڑھی عورت اس کی اس بے لوث خدمت پر دعائیں دینے لگی۔ اتنی دیر میں بھائی دوا لے آیا۔ اس نے دوا اس ضعیف عورت کو پلائی اور پھر آنے کا وعدہ کر کے اور دعائیں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

واپسی میں اس کی نظر ادیب کامل کے کمرے پر پھر پڑی، وہ نہ جانے کیا سوچ کر کمرے میں گئی۔ اس نے میز پر دیکھا ایک ادھورا مضمون سا رکھا ہوا دکھائی دیا۔ کسی نے مضمون لکھتے لکھتے کسی وجہ سے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اور اسی طرح کھلا چھوڑ کر شاید کسی ضرورت سے اچانک اٹھ گیا تھا۔ سکینہ نے ادھورے مضمون کی آخری سطریں پڑھیں، لکھا تھا:

"وہ بیٹا بڑا خوش نصیب ہے جو اپنے ماں باپ کو اس حالت میں پائے کہ وہ بوڑھے ہوں اور وہ ان کی خدمت کر کے جنت کا حق دار ہو جائے۔"

سکینہ یہ پڑھ کر سوچنے لگی۔ یہ مضمون تو ادیب کامل ہی کا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا لکھنے والا ماہ نامہ "سدھار" کا ایڈیٹر ادیب کامل کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بوڑھی اور بیمار ماں کو اکیلا گھر میں چھوڑ دے اور خود یار دوستوں کے ساتھ تفریح کرتا پھرے۔ سکینہ کو بڑا برا لگا۔ اس نے اسی مضمون کے آگے یہ کلمات اپنی طرف سے لکھ دیے:

"اور وہ بیٹا نہایت بدنصیب ہے جو اپنے والدین کو اس حالت میں پائے کہ وہ بوڑھے ہوں اور وہ جنت نہ حاصل کرے بلکہ جہنم کا حق دار بنے۔"

سکینہ نے یہ لکھ کر اپنے دستخط کر دیے۔ اس کے بعد گھر آ کر اس نے ایک طویل خط لکھا۔ اپنے خط میں اس نے یہ بھی لکھا کہ اس کے نام رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے۔ میں ایسے صاحب مضمون کا کوئی مضمون پڑھنا پسند نہیں کرتی جو لکھتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔

رسالہ اس کے نام آنا بند ہو گیا۔ سکینہ پر ادیب کامل کے کردار کا یہ مزید اثر پڑا کہ وہ سارے تعمیر پسند ادیبوں اور شاعروں سے نفرت کرنے لگی۔ اب اس نے اپنے مطالعہ کے لیے قرآن، حدیث اور سیرت وفقہ کی کتابیں منتخب کیں، اور انہی سے استفادہ کرنے لگی۔

سکینہ ایک ہائر سکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب جمیل صاحب کی لڑکی تھی۔ جولائی آنے پر جمیل صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ اپنے باپ کے ساتھ لکھنو چلی گئی۔ لکھنو پہنچ کر اسے

معلوم ہوا کہ یہاں عورتوں کے دینی اجتماعات ہوتے ہیں۔ وہ پابندی سے ان اجتماعات میں جانے لگی۔ چند ہی دنوں میں اجتماع کی خواتین سے اس کا ربط بڑھ گیا۔ گفتار اور کردار کی یکسانیت نے سکینہ کو تمام خواتین میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ یہیں ایک صاحب کے توسط سے اس کی شادی ایک صاحب کردار اور تندرست جوان عبداللطیف سے ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی۔

اس کا شوہر عبداللطیف واقعی نہایت اچھا آدمی تھا۔ اس نے اپنی نئی نویلی دلہن کو کتاب وسنت کی تعلیمات سے دلچسپی لیتے دیکھا تو ایک دن موجودہ دور کے تعمیر پسند ادیبوں کی کتابیں بھی خرید لایا۔ خوشی خوشی بیوی کو دینے لگا لیکن سکینہ نے کہا:

''میرے لیے قرآن وحدیث اور فقہ کی کتابیں کافی ہیں۔ میں ان ادیبوں کی کتابیں نہیں پڑھتی۔''

''کیوں؟'' عبداللطیف نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ یہ ادیب لکھتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔'' یہ سکینہ کا روکھا جواب تھا۔

''تم پردے میں بیٹھنے والی، تم کو یہ تجربہ کیسے ہوا؟'' عبداللطیف نے پھر سوال کیا۔

اس کے جواب میں سکینہ نے ''سدھار'' کے ایڈیٹر ادیب کامل صاحب کا واقعہ بیان کیا جسے سن کر عبداللطیف پر عجیب وغریب کیفیت طاری ہوگئی۔ سکینہ نے اس کی یہ کیفیت دیکھی، لیکن اس نے کچھ پرواہ نہ کی، اس نے بڑھ کر سیرت کی ایک کتاب اٹھالی۔ اسے کھولا اور سنجیدہ صورت بنا کر اس کے مطالعہ میں لگ گئی۔

عبداللطیف تھوڑی دیر بیٹھا اسے تکتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اٹھا، اپنے کمرے میں گیا اور وہاں سے ایک پرانا فائل اٹھا لایا۔ سکینہ کے آگے ڈال دیا۔ اور برابر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''ایک زمانہ تھا۔ میں مضمون نگار تھا۔ اور میرے مضمون ملک بھر میں بڑی دل چسپی سے پڑھے جاتے تھے۔''

پھر آپ نے مضمون نگاری کیوں چھوڑ دی۔ میں نے آپ کو کچھ لکھتے نہیں دیکھا۔''

''ہاں، اب میں نے وہ میدان چھوڑ دیا۔''

''کیوں؟''

''ذرا یہ فائل کھول کر دیکھیے ۔ میرا آخری مضمون جو آج تک ادھورا پڑا ہے اس کے بعد میں نے کچھ نہیں لکھا۔''

''میں یہی تو پوچھتی ہوں کہ آپ نے یہ میدان کیوں چھوڑ دیا۔''

''آپ ملاحظہ فرمائیں۔ خود آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔''

اس بات چیت کے بعد سکینہ نے فائل کھولا۔ ادھورا مضمون دیکھ کر وہ چونک سی پڑی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اپنے شوہر عبداللطیف کو دیکھنے لگی۔

''جی ہاں!'' عبداللطیف کہنے لگا۔''ایک زمانہ تھا جب میں ماہ نامہ ''سدھار'' نکال رہا تھا۔ یہ اسی زمانہ کا ادھورا مضمون ہے جو آج تک پورا نہ ہو سکا۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس مضمون کے آخر میں آپ ہی کی ہم نام ایک لڑکی نے کیا لکھا ہے؟''

''جی ہاں دیکھ رہی ہوں۔ کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ پھر کیا ہوا''؟

پھر یہ ہوا کہ جب میں نے واپس گھر آ کر اپنی بیمار ماں کو دیکھا تو ان کا برا حال تھا۔ ان ہی سے معلوم ہوا کہ سکینہ نام کی لڑکی آئی تھی، اور اس نے دوا پلائی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ میری والدہ کا اسی رات میں انتقال ہو گیا۔ مجھ پر سکینہ کے لکھے ہوئے فقروں کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ میں چپ سا رہنے لگا۔ پھر میں نے اس منافقت سے توبہ کر لی۔ رسالہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور یہاں لکھنو چلا آیا۔ یہاں آ کر اسلامک یوتھ آرگنائزیشن کے نوجوانوں سے ملاقات کی۔ ان نوجوانوں کو میں نے اپنے خیالات کے مطابق پایا اور ان کے ساتھ خدمت خلق کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اب اللہ کی توفیق سے جو کچھ ہو سکتا ہے کرتا ہوں اور جہاں تک ہوتا ہے اپنا کیا ہوا کام چھپاتا ہوں۔ اللہ سے نہیں۔ اس سے کون چھپا سکتا ہے۔ جو ڈھکا چھپا سب دیکھنے والا اور اچھے کام کرنے والوں کا اجر بھرپور دینے والا ہے۔ اور یہ سب اس لیے کرتا ہوں کہ شاید اب میرا مالک مجھ سے خوش ہو جائے اور میری پچھلی منافقت کو معاف کر دے۔''

عبداللطیف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور زیر لب نہ جانے کیا کہا، جسے سکینہ نہ سن سکی۔

''آپ نے سکینہ کو کوئی جواب دیا یا نہیں۔''

''میں کیا جواب دیتا۔ میرا پول کھل چکا تھا۔ اس نے ایک طویل خط میں مجھے برا بھلا

لکھا تھا۔ اس کا یہ خط اب بھی میں کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اسے پڑھ کر میرے اندر کا شیطان مجھ سے بھاگتا ہے۔''

''اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ سکینہ آپ کو مل جائے تو شاید شیطان ہمیشہ کے لیے فرار کی راہ اختیار کرے۔''

خدا جانے وہ غریب اب کہاں ہو۔ اگر وہ مجھ سے ملنا چاہے تو شاید میں کترا جاؤں۔''

''کیوں؟''

''میں کیا منہ لے کر اس کے سامنے آسکوں گا۔''

''اور اگر وہ خود آپ کے سامنے آجائے تو۔''

''تو میں کچھ بات کیے بغیر ٹل جاؤں گا۔''

''لیکن اگر خدا کو یہ منظور ہو کہ آپ اسے پا کر نہ ٹل سکیں تو؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہی سکینہ اس وقت آپ سے باتیں کر رہی ہے۔''

عبداللطیف نے ''الحمدللہ'' کہہ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ دعا کرتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خوشی کے آنسو۔ دعا کے بعد اس نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی انگلیاں آنکھوں سے لگا لیں۔ اس کی زبان سے نکلا۔

انھیں انگلیوں سے وہ فقرے لکھے تھے جنھوں نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ الحمدللہ۔

کنّو کی ماں

کنو بہت خوش تھا۔ وہ تیراکی میں سب سے آگے نکلا تھا۔ وہ خوش خوش پہلے باپ کے پاس گیا۔ باپ اس وقت اپنے دس بارہ ساتھیوں کے ساتھ ایک بڑی سی ناؤ بنانے میں لگا ہوا تھا۔ بیٹے کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش ہو گیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ بیٹے نے تیراکی میں اول انعام حاصل کیا ہے تو بولا ’’بیٹا! مجھے سچی خوشی تو اس وقت ہو گی جب تم خدا کی فرماں برداری کے سمندر میں کودو اور سب سے آگے بڑھ جاؤ اور اپنے اللہ سے انعام حاصل کرو۔‘‘

اور یہ کہہ کر باپ نے ناؤ میں آخری کیل ٹھونک دی۔ باپ کی نصیحت کنو نہ سمجھ سکا۔ وہ وہاں سے ماں کے پاس گیا اس نے اپنی کامیابی کا ذکر کیا۔ وہ خوش ہو گئی ’’شاباش بیٹا! شاباش! تجھ پر پانچ خداؤں کا سایہ ہے۔ تجھے تو اول آنا ہی چاہیے‘‘۔

’’امی! خدا کی فرماں برداری کا سمندر کیسا ہوتا ہے؟‘‘ بیٹے نے باپ سے سنا ہوا جملہ ماں کے سامنے دہرا دیا۔

’’اونہہ، تو کس کی باتوں پر سوچ بچار کرتا ہے، تیرے باپ کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تو دیکھتا نہیں، وہ یہاں ناؤ بنا رہا ہے۔ وہ یہاں ریت میں ناؤ چلائے گا۔ کہتا ہے کہ میرا کہنا مانو۔ ان بتوں کا سہارا چھوڑو۔ تجھے بتاؤں وہ ہمیں کس کے پاس جانے سے روکتا ہے، جن کی بدولت تیری زندگی ہے۔‘‘

’’میری زندگی؟‘‘ کنو کچھ نہ سمجھا، اس نے پوچھا ’’امی! میری زندگی کس کی بدولت ہے؟‘‘

’’بیٹا! میں برسہا برس اولاد کو ترستی رہی۔ پھر جب ان پانچوں کے آگے ناک رگڑی تو، تو پیدا ہوا۔‘‘

''اچھا! امی یہ بات ہے، وہ پانچ کون ہیں؟''

''یہی ہمارے خدا ودّ، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر۔ پھر جب تو پیدا ہوا تو میں نے دھوم دھام سے نذریں پوری کیں۔ تیرا باپ کیسا کیسا ناراض ہوا۔ کہتا تھا کہ اولاد دینے والا تو خدا ہے۔ میں اس بات سے انکار کب کرتی ہوں لیکن جب تک ان خداؤں کو خوش نہیں کیا، مراد پوری نہیں ہوئی، اولاد سے محروم رہی۔''

''تو باپ ان کے استھانوں پر جانے سے منع کرتے ہیں؟''

''ہاں بیٹے! ساری قوم تیرے باپ سے ناراض ہے کوئی بھی تو خوش نہیں۔ کچھ ٹھٹھیرے ہیں رذیل ذات کے جن کا ہماری سوسائٹی میں کوئی مقام نہیں۔ جن کو ہم سب رذیل سمجھتے ہیں۔ ان کو وہ اپنے اردگرد لیے ہوئے ہے اور ان کو ہم سب سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ دماغ نہیں خراب ہوا تو اور کیا کہا جائے گا''۔

''امی! ہم تو ان ٹھٹھیروں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا بھی پسند نہیں کرتے۔''

''ہاں بیٹا! ان رذیلوں کی طرف ہو کر بھی کبھی نہ نکلنا!''

''کبھی نہیں امی! کبھی نہیں۔''

''اور دیکھو بیٹا! (ماں کا لہجہ اور بدلا) باپ کے چکر میں نہ آنا۔ تم دیکھتے ہو تمہارے باپ کی عمر اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ اس عمر میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ اپنے باپ کی بہکی بہکی باتیں سنتے ہی ہو۔ وہ اپنے کو خدا کا رسول کہتا ہے۔ بھلا خدا کا رسول ایسا ہوتا ہے۔ خدا کا رسول ہوتا تو اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں فرشتے ہوتے۔ اگر ہم خدا کے نبی کے بارے میں کوئی بری بات نکالتے تو ہماری زبان جل جاتی۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کوئی دن نہیں ہوتا جب قوم تمہارے باپ کو برا نہ کہتی ہو مگر کسی کا ایک بال بھی کبھی بیکا نہ ہوا۔''

''امی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ کل کی بات ہے، سواع کی وادی میں قوم کے بڑے بڑے لوگ جمع تھے، باپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں جا دھمکے اور لگے اپنی اڑانے۔ ''خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔'' کسی نے سن کر نہ دیا تو عذاب کی دھمکی دی کہ اگر تم میری بات نہ مانو گے تو پانی کے طوفان سے برباد ہو جاؤ گے۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ بھلا پانی کا طوفان ہمارا کیا کر لے گا ایک سے ایک تیر اک قوم میں موجود ہے۔''

''بیٹا! تمہارے باپ کا دماغ چل گیا ہے۔ کیسا پانی اور کیسا طوفان؟''

''یہی تو سب لوگ کہنے لگے۔ اس ریگستانی علاقے میں کبھی تو پانی برسا نہیں۔ یہاں پانی کا طوفان کیا معنی؟'' اس کے بعد ایسا ایسا ذلیل کیا کہ توبہ بھلی۔ خود وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ذلیل ہوئے۔ قوم کے لوگ اسی طرح رنگ رلیاں مناتے رہے۔ کسی کو کچھ بھی تو نقصان نہ پہنچا۔''

''یہی تو میں کہتی ہوں، مگر ضدی بڈھے کی اڑ دیکھو، اپنی کہے چلا جا رہا ہے، ضد یہ ہے کہ بزرگوں سے جو ہوتا چلا آیا ہے اسے چھوڑ دو اور وہ کرو جو میں کہوں۔ کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں۔'' بھلا کوئی اپنے گھر کی بات اور رسم چھوڑ دے گا۔ اپنا دین دھرم کھو دے گا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ناک کٹ جائے گی امی!''

ماں نے بیٹے کو گلے سے لگا لیا، اسی وقت ایک عورت نے آ کر کہا:

''اے کنو کی ماں! سنتی ہو، انہونی بات!''

''کیا ہوا کیا؟''

''عجیب وغریب بات، جو کبھی نہیں ہوئی۔''

''اری بتا تو!''

''وَدّن تنور میں آگ جلا چکی تھی کہ اچانک اس میں سے پانی ابلنے لگا۔''

''ارے وا، بالکل انوکھی بات۔''

''اور اب وہ پانی ابلتا ہی چلا آ رہا ہے۔''

''ایسا؟''

''ہاں۔ اس کا گھر پانی سے بھر گیا اور سارا سامان تہس نہس ہوگیا''۔

ٹھیک اسی وقت ایک گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی ''کنو بیٹا! اور اے کنو کی ماں! اپنے اصل مالک کو پہچانو۔ خدا کا عذاب آ گیا۔ طوفان کی ابتدا ہوگئی۔ میری بات مانو اور میرے ساتھ آؤ۔ میں نے جو ناؤ بنائی ہے اب اسی میں پناہ مل سکتی ہے''۔

کنو نے مڑ کر دیکھا، بوڑھا باپ سامنے کھڑا تھا۔ کنو نے ہنس کر کہا:

''باپ! میں نے تم کو بتایا کہ میں تیرنے میں اول آ چکا ہوں۔''

''ارے بیٹا! جو طوفان آ رہا ہے وہ تمہارے بس کا نہیں۔''

''تو میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔''

''طوفان وہاں بھی تمہیں نہ چھوڑے گا۔''

''اچھا اچھا، تم جاؤ، ہم ڈوب جائیں گے مگر ہم اپنی قوم کے ساتھ رہیں گے۔'' کنو کی ماں جھنجھلا کر بولی۔

میں آخری بار سمجھانے آیا ہوں، وہ دیکھو آسمان پر بادل آنا شروع ہو گئے۔ سن لو، آسمان سے بھی پانی برسے گا اور زمین کے سوتے بھی پھوٹ بہیں گے۔ ہر جگہ جل تھل ہو جائے گا۔ امن کی جگہ صرف وہ ناؤ ہے جو میں نے اور میرے ساتھیوں نے بنائی ہے۔ اور اس میں وہی سوار ہو سکتا ہے جو خدا پر، خدا کے رسول پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے۔''

''اچھا جاؤ، جان نہ کھاؤ۔ ہم اپنی قوم کے ساتھ رہیں گے۔''

''ساری قوم تباہ ہو جائے گی۔''

''ہو جانے دو، تم سے کیا!''

ماں اور بیٹے دونوں نے سنی ان سنی کر دی۔ نصیحت کرنے والا مایوس ہو کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بوندیں پڑنے لگیں۔ پھر پانی برسنے لگا اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ زمین سے بھی سوت پھوٹ نکلے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ جہاں خشکی ہی خشکی تھی، ایک سمندر میں تبدیلی ہوگئی۔ ساری قوم ڈوب گئی۔ ایک کشتی اس سمندر میں تیر رہی تھی، جس میں اللہ کا نبی اپنے بارہ صحابہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ یہ تھے حضرت نوح علیہ السلام۔

مقدر ہو تو ایسا ہو

یا حارث! اب کیا ہوگا؟ ہمارا اونٹ تو........

حارث نے بیوی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے نکیل ڈھیلی کر دی۔ اونٹ بیٹھ گیا۔

"آؤ اس پر سے سامان اتار لیں۔" اس نے بیوی سے کہا اور پھر دونوں سامان اتارنے لگے۔

"عین اس وقت جب منزل سامنے ہے ہمارا اونٹ بیمار ہو گیا۔

دکھ بیماری سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔

قبیلے کی عورتیں شہر پہنچ چکی ہوں گی، اور انھوں نے رئیس گھرانوں کے بچے لے لیے ہوں گے۔"

بیوی کی بات سن کر حارث سامنے دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے شاید وہ سب واپس پڑاؤ پر آ رہی ہیں۔ ورنہ پڑاؤ پر یہ چہل پہل نہ ہوتی۔"

"اب شاید ہی ہمیں کوئی بچہ ملے!" بیوی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

سامان اتر چکا تھا۔ حارث نے اونٹ کے کانوں پر ہاتھ پھیرا وہ جھکے ہوئے تھے، اس کی گردن ٹٹولی وہ تن رہی تھی۔ منھ کھول کر اس کی زبان دیکھی وہ خاردار تھی۔ پیچھے جا کر اونٹ کی دم دبائی۔ اونٹ نے کوئی گدگدی محسوس نہیں کی۔

"ہم برباد ہو گئے۔"

"تو کیا اونٹ مر جائے گا۔"

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''کیا معلوم تھا کہ منزل کے سامنے دھوکا دے گا۔''

''خدا کی مصلحت خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمیں پڑاؤ تک چلنا تو ہے ہی۔ لاؤ سامان مجھے دو اور تم نکیل تھامو۔''

اور یہ کہتے ہوئے شوہر نے سامان کاندھوں پر لادا۔ بیوی نے نکیل تھامی۔ دونوں ملول اور مایوس انسان کی طرح پڑاؤ کی طرف چلے۔ پڑاؤ پر پہنچ کر دیکھا کہ واقعی کچھ عورتیں شہر سے واپس آ چکی تھیں۔ اور ان کی گودوں میں بچے تھے۔ کچھ آ رہی تھیں۔ ایک عورت کی گود میں ایک تنومند بچہ تھا۔ اور وہ کسی رئیس کا معلوم ہو رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر بولی:

''واللہ! میں کامیاب لوٹی۔ تمہارا اونٹ اب کیسا ہے؟''

''نہ جانے راستے میں اسے کیا ہو گیا۔''

''اگر تم ہمارے ساتھ شہر میں داخل ہوتیں تو یہ رئیس ابن رئیس بچہ تم کو ملتا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس بچے کا باپ بار بار تم کو پوچھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ قبیلہ ہوازن میں بنوسعد کی عورتیں سب سے اچھی ہوتی ہیں اور ان سب سے زیادہ تمہاری تعریف ہو رہی تھی۔''

''کیا شہر میں کوئی بچہ باقی بھی ہے۔''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ابھی تو سب آ رہی ہیں۔ تم جاؤ ضرور!''

بے چاری نے شوہر کو پڑاؤ پر چھوڑا اور خود شہر کی طرف چلی۔ جس عورت کو شہر سے آتے ہوئے دیکھتی اس سے پوچھتی، تم نے کون سا بچہ پایا اور کیا شہر میں کوئی بچہ باقی بھی ہے؟

عورت کہتی: ''جلد جاؤ، ہر ایک تم کو پوچھ رہا تھا۔ بچوں کی تربیت میں تمہارا بڑا نام ہے۔ مگر مجھے امید نہیں کہ تم کوئی بچہ پا سکو۔''

وہ تیز تیز چلنے لگی۔ وہ ہر عورت سے وہی سوال کرتی اور اسے وہی جواب ملتا۔ ایک آخری عورت جو شہر سے نکلی اس نے بتایا ''اب کوئی بچہ نہیں رہا۔ ہاں ایک یتیم بچہ ہے۔ اس کا باپ مر چکا۔ اس کا دادا ہے تو اپنے قبیلے کا سردار، مگر صاحب عیال ہے۔ بچے کی صرف ماں ہے۔ وہ ہمارا حق الخدمت کیا دے سکے گی۔ ہم سب نے اس بچے کو لینے سے انکار کر دیا۔ تم چاہو تو اسے جا کر لے لو۔''

قدم سست پڑ گئے۔ اس نے ارادہ کیا کہ واپس لوٹ جائے۔ مگر دل نے کہا کہ خالی ہاتھ واپس جانا صحیح نہیں۔ چل کر بچے کے گھرانے کو تو دیکھنا چاہیے۔ اس نے بچے کی ماں کا پتہ پوچھا اور اس طرف مڑ گئی۔ ادھر سے ادھر ہوتی ہوئی ایک مکان کے سامنے کھڑی ہوئی۔

''اہلاً وسہلاً۔ آؤ بہن! کیا تم کو کوئی بچہ نہیں ملا۔'' مکان کی مالکہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے باہر آ کر کہا ''اگر تم پسند کرو تو میرا بچہ لے سکتی ہو۔''

وہ اندر چلی گئی۔ اس نے دیکھا، نہایت مختصر سامان گھر میں ہے۔ پوچھا: آپ کے اونٹ اور آپ کی بھیڑیں کہاں ہیں؟''

''شاید تم کو معلوم نہیں، میرا بچہ یتیم ہے، ورثے میں اسے ایک اونٹ، چار بھیڑیں اور ایک لونڈی ملی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں!''

''تو پھر اس اجڑے گھر سے کیا حاصل؟ لیکن وہ یہ کہتے کہتے الفاظ دبا گئی۔ مالکہ مکان اس کی بات کو پا چکی تھی۔ اس نے کہا:

''تم بچے کو دیکھ تو لو۔ میرا خیال ہے تم اسے پسند کرو گی، اور دیکھو شرماؤ نہیں۔ میں نے تمہاری بات کا اثر نہیں لیا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''حلیمہ!''

''مرحبا! یعنی حلیمہ سعدیہ؟''

''جی ہاں، میرا تعلق ہوازن کے قبیلہ بنو سعد سے ہے۔''

''ہمارے شہر مکہ کے قبیلہ قریش کے سب ہی لوگ یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنا بچہ تم کو دیں۔''

''لیکن ہمارا اونٹ راستے میں بیمار ہو گیا اور میں محروم رہ گئی۔''

''تو کیا تم محروم ہی جاؤ گی؟''

''میں محروم جانا نہیں چاہتی۔''

''میرے یہاں تمہارے خاندان کی بہت سی عورتیں آئیں لیکن انہوں نے مال داروں کے بچوں کے مقابلے میں میرے بچے کو نہیں لیا۔ اگر تم محروم جانا نہیں چاہتی ہو تو میرے بچے کو دیکھ لو۔''

''کہاں ہے آپ کا بچہ۔''

''وہ اس وقت سو رہا ہے۔ آؤ میرے ساتھ!''

بچہ جاگ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی اسے اٹھا لے۔ وہ ایک نئی عورت کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ بچہ کچھ اس طرح مسکرایا کہ حلیمہ سعدیہ کا دل اس کی طرف کھنچنے لگا، چھاتیوں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے بڑھ کر گود میں بھر لیا۔ اور فوراً داہنا دودھ منہ میں دے دیا۔ خاتون خانہ ''اَحْسَنْتِ وَمَرْحَبًا'' پکار اٹھی۔

یہ سب چند منٹ میں حلیمہ سعدیہ کی حالت بے خودی میں ہو گیا۔ نہ جانے وہ کیا بات تھی کہ وہ ایک یتیم بچے کو لے کر اس طرح مطمئن ہو گئی گویا کائنات کی دولت اسے مل گئی۔

وہ جس وقت بچے کو لے کر واپس ہو رہی تھی اس وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے تھکے ہوئے پاؤں میں غیر معمولی قوت ابھر آئی۔ پڑاؤ پر اس کا انتظار ہو رہا تھا کہ وہ آ لے تو قافلہ واپس ہو۔ اس کے آنے پر جب عورتوں کو معلوم ہوا کہ وہ اس یتیم بچے کو لے آئی، جس کو لینے سے سب نے انکار کر دیا تھا تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا: ''چلو محرومی سے تو یہ اچھا ہی رہا۔''

عورتوں کے اس فقرے میں ایک طرح کا طنز تو تھا مگر حلیمہ سعدیہ نے اس طنز کو محسوس نہیں کیا۔ اس نے شوہر سے کہا ''ذرا اس بچے کو دیکھو اور آسمان کی طرف نظر کرو۔'' شوہر نے بچے کو دیکھا اور اوپر نظر ڈالی۔ ابر کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا جو حلیمہ سعدیہ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ بچہ ہمارے لیے بہت مبارک ثابت ہوگا۔''

اچھا تو اونٹ لاؤ، اب وہ کیسا ہے؟''

حارث نے حلیمہ سے کہا کہ:

''وہ تو بالکل اچھا ہے، اس کے کان گرم ہیں۔ گردن میں تناؤ باقی نہیں رہا۔ وہ اب غیر معمولی گدگدی محسوس کر رہا ہے۔''

''تم نے دوا کیا دی؟''

''کچھ نہیں، میں دوا کیا دیتا۔ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔''

''تو آپ سے آپ اچھا ہو گیا۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس بچے کی آمد کی برکت ہے۔''

''لاریب۔''

یہ دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ قافلہ چل پڑا۔ حلیمہ سعدیہ بچے کو لے کر اونٹ

پر بیٹھیں۔شوہر نے نکیل تھامی، اونٹ نے گردن اونچی کی۔ پھر سیدھی کر کے بڑھا تو سب سے آگے پہنچ گیا۔

اب وہ سارے قافلے سے آگے آگے چل رہا تھا۔ ''یا حارث! یہ اونٹ تو بیمار تھا اتنی جلد توانا کیسے ہو گیا؟'' لوگوں نے پوچھا۔

''یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔''

''وہ تو کسی اونٹ کو اپنے سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔''

''مجھے بھی حیرت ہے۔''

''کوئی خاص بات ضرور ہے!''

''خاص بات تم یہ نہیں دیکھتے کہ حلیمہ کا اونٹ جتنا ہی تیز چلتا ہے اس کے اوپر ابر کا ٹکڑا اسی رفتار سے ساتھ بڑھ رہا ہے۔''

''یا للعجب! یہ کیا کوئی معجزہ ہے؟''

''میں کچھ نہیں جانتا، حلیمہ سے پوچھو۔''

''قافلہ سالار حلیمہ کی طرف متوجہ ہوا، حلیمہ نے بتایا، اگر میں اس بچے کو فوراً اٹھا نہ لیتی تو میری چھاتیاں دودھ کی فراوانی سے پھٹ جاتیں۔'' اور یہ کہتے کہتے یہ نغمہ زبان سے پھوٹ نکلا۔'' سب حیران ہیں اور طنز کرتی ہیں۔ حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ ابر نے ہم پر سایہ کر لیا ہے۔ کیا یہ سایہ سایۂ رحمت نہیں ہے؟

اے لوگو! مت گھبراؤ عرب کی ریت عنقریب ٹھنڈی ہو جائے گی اور آسمان؟ تمازت آفتاب کے بدلے رحمت برسانے والا ہے۔، ہوازن والو! تم کو مبارک ہو! سعادت ہمارے ساتھ ہے۔ برکت ہمارے ساتھ ہے۔ رحمت ہمارے ساتھ ہے، عظمت ہمارے ساتھ ہے، اور محبت؟ یہ صرف میرا حصہ ہے''۔

گیت کا آخری فقرہ کہہ کر حلیمہ نے بچے کو گلے سے لگا لیا۔ قافلہ بڑی رفتار سے ہوازن کی طرف جا رہا تھا۔ تمام عورتیں خوش خوش طرح طرح کے نغمے بکھیر رہی تھیں، لیکن ملتی تھی جس کو دولت کونین مل گئی۔

الحاج رحیمو

''نعرۂ تکبیر............!''

''اللہ اکبر!''

''ارے!'' میں چونک پڑا۔

''حاجی کریم الدین!''

''زندہ باد!!!''

میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ اگر اسٹیشن تک میرے ساتھ چلنا ہے تو خاموشی سے چلنا ہوگا ورنہ مجھے یہیں گھر سے رخصت کر دو۔ سب نے میری اس بات کو مان لیا تھا۔ تھوڑی دور تک خاموشی سے چلے۔ لیکن راستے میں رحیمو نے ہم کو جاتے دیکھا تو دوڑا دوڑا ایک طرف گیا اور دس منٹ کے بعد بھاگا بھاگا واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گجرا تھا۔ اس نے گجرا لا کر میرے گلے میں ڈال دیا۔ اور پکارا ''نعرۂ تکبیر!''

جیسے سارے کے سارے لوگ منتظر ہی تھے۔ بیساختہ سبھی پکار اٹھے: ''اللہ اکبر!'' ''اور میں ''ارے'' کہہ کر رہ گیا۔ پھر جب رحیمو نے ''حاجی کریم الدین'' کہا تو سب نے ''زندہ باد'' کہہ کر جواب دیا۔ اور میں اس شور پر گھبرانے لگا۔ گجرا اتار کر میں نے ایک ساتھی کو تھما دیا اور رحیمو کو سمجھانے لگا کہ ایسا نہیں کرتے، مگر وہ نہ مانا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا اور حاجی کریم الدین زندہ باد کہتا اور کہلواتا چلا۔ میں نے اسے پھر سمجھایا کہ دین میں اصل اہمیت عبادت کی ہے۔ عبادت میں شور کرنا صحیح نہیں۔ حج فرض ہے جو اس فرض کے دائرے میں آئے اسے زیارت کعبہ کے لیے جانا چاہیے نہ کہ یوں شور مچانا چاہیے۔ تم سے یہ تو نہ ہو سکا کہ حج کو چلتے۔ خواہ مخواہ شور مچاتے ہو، جاؤ، واپس جاؤ۔

آخری فقرے میں نے بڑی سنجیدگی سے کہے۔ میری سنجیدگی میں کسی قدر غصہ بھی تھا۔ خصوصاً آخری فقرے سے میرے جذبات صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ رحیمو نے آخری فقرہ سن کر شاید اپنی ہتک محسوس کی۔ وہ چپ ہو کر لوٹ گیا۔ میں پھر دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ اسٹیشن پہنچا، گاڑی آئی، سوار ہوا۔ سب سے ہاتھ ملایا۔ سلام ہوا پھر جب ریل نے رینگنا شروع کیا تو رومال ہلنے لگے اور گاڑی پلیٹ فارم پر آگے بڑھنے لگی۔

''خبردار! خبردار!''

''چلتی گاڑی میں سوار مت ہو۔''

میں نے پیچھے ایک شور سنا۔ کھڑکی سے سر نکالے ہوئے تھا ہی۔ میں نے دیکھا کہ جب گاڑی کا آخری ڈبہ پلیٹ فارم کو پار کر رہا تھا ایک جوان آدمی نے کود کر ایک ہاتھ سے ہینڈل پکڑا اور لٹک گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک اٹیچی تھی۔ ہینڈل پکڑ کر اس نے پائیدان پر پاؤں جما دیے اور سواریوں نے اسے سہارا دے کر اندر کر لیا۔ چلیے اللہ اللہ خیر صلا۔ آج کل ایسا ہوتا ہی رہتا ہے بات آئی گئی ہوئی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پھر دوسرے لمحے ادھر ادھر کی باتوں میں لگ گئے۔ اور یہ بھول گئے کہ کوئی یوں سوار ہوا تھا۔ نئی بات بھی تو نہ تھی جو یاد رکھی جاتی۔

گاڑی لکھنو پہنچی۔ اسٹیشن پر رکی۔ میں نے قلی کو آواز دی۔ قلی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہی تھا، وہ اندر آ گیا۔ اس نے میرا سامان سر پر رکھا اور جھانسی والی گاڑی کے پلیٹ فارم پر لے کر چلا، میں اس کے ساتھ دو قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے سلام کیا۔

''السلام علیکم۔'' آواز جانی پہچانی لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا رحیمو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

''ایں تم کیسے؟''

''میں بھی چلوں گا۔''

''اے سبحان اللہ!''

''آپ نے فرمایا تھا کہ حج مجھ پر بھی فرض ہے۔''

''ماشاءاللہ!''

''تو میں بھاگا بھاگا گھر گیا۔ اٹیچی سنبھالی اور نوٹ رکھے، پتہ نہیں کتنے ہیں جو ہاتھ لگے، لے کر بھاگا۔ بیوی سے چلتے چلتے کہہ دیا، حج کو جا رہا ہوں۔''

''خوب!''

''جی ہاں!''

''مگر ممبئی میں بڑی مشکل کا سامنا ہوگا۔ نہ تمہاری درخواست، نہ اجازت، نہ تم نے چیچک کا ٹیکہ لگوایا۔ نہ ڈی ایم کا سارٹیفکٹ، تم کو پاسپورٹ کیسے ملے گا۔''

''فکر نہ کیجیے، سب مل جائے گا۔''

''مل کیسے جائے گا۔ آئے دن اخبارات میں حج کمیٹی کی طرف سے اعلانات ہوتے رہتے ہیں کہ جب تک منظوری نہ ملے کوئی شخص ممبئی نہ آئے۔''

''اونھ، آپ جانے کیا فرماتے ہیں۔ جس اللہ نے اچانک دل میں بات ڈالی وہی اللہ وہاں بھی غیب سے انتظام فرمادے گا۔ آپ دیکھیے گا۔''

''بارک اللہ، بڑا مضبوط عقیدہ ہے تمہارا۔''

''دعا فرمائیں۔''

''ارے میاں قلی! دیکھو اس ڈبے میں بٹھانا جو جھانسی میں کٹ کر ممبئی والی گاڑی میں جوڑ دیا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''حضور اس میں بڑا رش ہے، دیکھیے وہ ہے سامنے، تلے اوپر آدمی ٹھسے جارہے ہیں۔'' قلی نے جواب دیا۔

آئیے پیچھے کے ڈبے خالی پڑے ہیں، ان میں آرام سے بیٹھیے، ابھی ایک گھنٹہ گاڑی چھوٹنے میں ہے۔ جتنی چاہیے جگہ لیجیے۔ رحیمو نے مشورہ دیا۔

''جتنی چاہیے! خوب، اور جب سواریاں آنے لگیں گی تو؟''

''تو کیا ہمیں اٹھادیں گی۔ میں جو آپ کے ساتھ ہوں۔'' رحیمو تن کر بولا۔

اچانک میرا دھیان اس رحیمو کی طرف گیا۔ جو میرے گاؤں کا ایک کڑیل جوان تھا۔ لاٹھی لیے ہر طرف دندناتا پھرتا تھا۔ محرم کے دنوں میں یہ پکا عزادار بن جاتا۔ یا حسین یا حسین کہہ کر ہر رنگ سے ماتم کرتا، چھریوں کا ماتم وہ سب سے اچھا کرتا تھا۔ اونچے سے اونچے تعزیے منگانے کی کوشش کرتا۔ پھر جب تعزیہ لے کر چلتا تو جان بوجھ کر راستے کے قواعد کی خلاف ورزی کر کے ایسی جگہ نکلتا کہ کسی ہندو کا درخت نیم یا برگد کا ہوتا، گنڈاسا رحیمو کے ہاتھ میں ہوتا۔ پیڑ

کے پاس پہنچتے ہی یہ ''حسینی مجاہد'' پلک جھپکتے چڑھ جاتا اور درخت کی ٹہنیوں کا صفایا کر دیتا۔ پکا مسلمان جو ٹھہرا۔

پھر یہی مجاہد ربیع الاول کے مہینے میں اس دھوم سے میلا د شریف کراتا جس کی مثال نہیں۔ شہر سے مولوی بلایا جاتا، شہر کا حلوائی آتا وہ نکتیاں بناتا۔ شہر سے باورچی آتا، دیگوں کے جھناٹے کی آوازیں بلند ہوتیں، کھانا تیار ہوتا، سارے گاؤں کی دعوت ہوتی ۔ اسلام کی خاطر دولت قربان کرنے والے آخر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

پھر بڑے پیر کے چاند میں بڑے پیر کا بکرا ذبح کیا جاتا، وہ بکرا جسے رحیمو سال بھر تک جلیبیاں کھلا کر پالتا تھا، یہ تھا اس کا پکا عقیدہ۔ پھر جب رجب کا مہینہ آتا تو رجبی شریف کے کیا کہنے۔ ۲۲ رجب کے کونڈوں سے لے کر ۲۷ رجب تک گاؤں بھر میں گھی کی ٹکیاں اور تبارک کی روٹیاں کھائی جاتیں اور بانٹی جاتیں۔

پھر شعبان کی ۱۴ تاریخ کو پٹاخوں کا قلعہ بنتا اور اس قلعہ کو دیا سلائی لگا کر شیطان کو بھگانے کے لیے وہ بھٹا بھٹ کی آوازیں ہوتیں کہ چاہے شیطان نہ بھاگتا ہو۔ گاؤں کے سنجیدہ لوگوں کو سونا نصیب نہ ہوتا۔ رحیمو رات بھر جاگتا۔ آدھی رات تک آتش بازی کرتا۔ آدھی رات کے بعد زیارت قبور کو جاتا۔

پھر جب گڑیوں اور ساون کا مہینہ آتا تو رحیمو سے بڑھ کر کشتی کا شوقین کوئی نہیں۔ دیوالی آتی تو اس کا حق ادا کرتا۔ پھاگن آتا تو پھاگ کھیلنے میں اس کا جواب نہ تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا ایسا علم بردار بن جاتا، کہ تھا تو مسلمان، مگر شراب کے نشے میں ڈمرو بجانے والوں کے ساتھ سب سے بڑی تان اڑاتا۔

چل چلیے بھونرا بگیا کو
چل چلیے بھونرا بگیا کو

اس دن گھر ایسی حالت میں واپس آتا کہ رواداری کے سارے نشانات اس کے کپڑوں پر، اس کے چہرے پر اور اس کے بدن پر ہوتے۔ اگر ایک طرف اس کے ماتھے اور چہرے پر پاک گلال ملا ہوتا تو دوسری طرف اس کے کپڑے مختلف رنگوں اور گندگی سے تر ہوتے۔

رمضان المبارک کے مہینے میں اس سے بڑھ کر کوئی روزہ دار نہ ہوتا۔ دین کا جوش

ملاحظہ ہو، کیا مجال گاؤں میں ہندو یا مسلمان کوئی پان کھا کر تو نکلے، چلم پیتا ہوا دکھائی دے، رحیمو خون خرابہ کر دیتا، وہ مغلظات بکتا کہ کنواری لڑکیاں گھروں کے اندر بھاگ جاتیں اور پھر بھی کہتا کیا بتاؤں، روزے سے ہوں ورنہ بتاتا۔

تراویح بھی بڑے شوق سے پڑھتا۔ حافظ جی کو جوڑا بھی دیتا۔ رمضان بھر کسی نے اسے بھٹی کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ عید کے دن بھاری جوڑا پہنتا، عید کی نماز کو جاتا کودتا پھاندتا اگلی صف میں جا بیٹھتا۔

ایک بار رمضان ختم ہونے پر ایک منچلے نے کہہ دیا: ''رحیمو بھائی! شکر ہے روزوں سے نجات ملی۔ پھر وہی ہم ہیں وہی دن ہیں، وہی راتیں ہیں، پھر رندوں کے پو بارہ ہیں، پھر سینما اور ریکارڈنگ پھر........''

اس منچلے کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ رحیمو اس سے لڑ پڑا تھا۔ اگر لوگ بیچ بچاؤ نہ کر دیتے تو وہ یہ روزوں کی ناقدری برداشت نہ کرتا۔

یہی رحیمو لکھنو میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''میں جو آپ کے ساتھ ہوں۔''

مطلب یہ کہ مجال ہے کسی کی، جو ہماری جگہ چھو لے۔ مجھے اندیشہ پیدا ہو گیا، کہیں یہ دین دار مجاہد کسی سے ''جہاد'' نہ کر بیٹھے۔

میں اندیشے میں تھا اور رحیمو ڈبے میں آنے والے ہر مسافر سے بتا رہا تھا آپ حاجی کریم الدین صاحب ہیں، ہمارے گاؤں کے۔ میں بھی آپ کے ساتھ حج کو جا رہا ہوں۔

آنے والے بڑی قدر کی نظروں سے ہمیں دیکھتے۔ ہندو مسلمان تمام مسافروں نے ہمارے احترام کو جھانسی تک اور پھر جھانسی سے ممبئ تک برقرار رکھا اور یہ طفیل تھا ہمارے رحیمو کی اس زبان کا جو اس کے منہ میں تھی۔

ممبئ پہنچ کر صابو صدیق کے مسافر خانے میں ہمارا قیام تھا۔ میں تو مطمئن تھا کاغذات میں نے حج کمیٹی کے لوگوں کے سپرد کر دیے اور بستر لگا کر چین سے لیٹ رہا۔ رحیمو سے کہا ''میاں تمہارا جانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔''

''کچھ بھی نہیں۔''

اور یہ کہہ کر رحیمو کہیں چلا گیا۔ رات گئے واپس آیا۔ میں نے پوچھا:

’’کہاں تھے؟‘‘ بولا ’’مولانا شوکت علی صاحب کے صاحبزادے زاہد صاحب سے ملنے گیا تھا۔‘‘

’’اچھا، خلافت کے زمانے میں تم نے.......‘‘

’’جی ہاں، جی ہاں، زاہد صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ کوئی تدبیر کریں گے۔‘‘

دوسرے دن رحیمو پھر غائب رہا۔ عشاء کے وقت آیا تو میں نے خیریت پوچھی۔ بولا مولانا زاہد صاحب نے ایک معلم کے سپرد کر دیا ہے۔ معلم کہتا ہے کہ اس کے یہاں ہمارے گاؤں کے سب حاجی ٹھہریں تو ایک شخص کا پاسپورٹ دلا دیں گے۔ چچا میاں کیوں نہ آپ، اور رحیم آباد کے آپ کے دوست علیم میاں اور ان کے ساتھی اس معلم کے یہاں جا ٹھہریں۔‘‘

’’علیم میاں سے کہہ کر دیکھتا ہوں۔‘‘

’’تو پھر نیک کام میں دیر کا ہے کی۔‘‘ رحیمو اسی وقت مجھ کو علیم میاں کے پاس لے گیا۔ سارا حال سن کر انھوں نے حامی بھر لی۔

پھر مجھے نہیں معلوم کہ معلم کے اختیار میں کیا قانون تھا۔ جس سے وہ رحیمو کو لے جاتا لیکن جب میں جہاز پر سوار ہوا تو رحیمو اس جہاز میں ہمارے ساتھ تھا۔ مزید کھوج کرید پر معلوم ہوا کہ معلم کے آدمی نے اپنی جگہ اسے دے دی تھی۔ رحیمو کا یہ دعویٰ تھا کہ سچی لگن ہو تو اللہ ضرور کامیاب کرتا ہے۔‘‘

’’خوب!‘‘ کہہ کر میں اپنی سیٹ پر قرآن کھول کر بیٹھ گیا۔

رحیمو جہاز کی سیر کو چلا گیا۔ میں قرآن پڑھ ہی رہا تھا کہ جہاز کا کپتان معائنہ کرتا ہوا آتا دکھائی دیا، اس کے ساتھ اس کا اسسٹنٹ بھی۔ اور پیچھے پیچھے رحیمو بھی۔ یہ سب ہماری سیٹ کی طرف آئے، میرے بالمقابل علیم میاں تھے۔ کپتان نے ہم سب کو غور سے دیکھا۔

’’حضور! یہ ہیں علیم میاں!‘‘ رحیمو نے کپتان سے کہا۔ علیم میاں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کپتان نے ہاتھ ملایا۔

’’تشریف لائیں، وہ علیم میاں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رحیمو نے آکر خبر دی کہ علیم میاں کو ان مسافروں کا امیر بنایا گیا ہے۔‘‘

''ارے بھئی، یہ کیسے!؟''

''میں نے اسٹنٹ صاحب سے بتایا۔ ایسا ولی اللہ آدمی حج کو جا رہا ہے اسٹنٹ کپتان نے مجھے چائے بھی پلائی اور کپتان صاحب سے کہا۔

''بڑی پہنچ ہے تمہاری''

''بزرگوں کی دعائیں ہیں۔''

علیم میاں امیر سفر ہو گئے تو رحیمو کی بن آئی۔ وہ اب ہر وقت اسٹنٹ کپتان کے ساتھ رہتا۔ ایک ہفتہ ہم لوگ ''سفینے'' پر رہے۔ ایک ہفتہ میں رحیمو اور اسٹنٹ آپس میں دوست ہو چکے تھے۔ رحیمو کے لیے یہ کوئی بڑی بات بھی نہ تھی۔ ہمارا گاؤں تھانہ کبیر پور میں لگتا ہے۔ کبیر پور میں جو بھی تھانیدار آیا ہفتہ عشرہ میں رحیمو کا جگری دوست بن گیا۔ ''بسی کرن منتر'' رحیمو کو خوب آتا تھا۔

جدہ میں معلم کے وکیل سے ملاقات ہوئی۔ ہم دو دن وہاں ٹھہرے۔ دو دن میں رحیمو نے نہ جانے کتنی معلومات فراہم کر لیں۔ حجاج منزل کے علیم صاحب جا کر مل آیا۔ خدا جانے ان سے ہمارا تعارف کیسے لفظوں میں کیا کہ وہ ملنے آئے اور بلا لے گئے۔ عصر کے بعد چائے پلائی اور زیتون کے تیل سے بنایا ہوا کھاجا، کھلایا۔

پھر ہم مکہ گئے تو مدرسہ صولتیہ کے سلیم صاحب نے بلا بھیجا۔ اور دعوت دی کہ مدرسہ میں ٹھہریں۔ خیر ہم مدرسہ میں تو نہ ٹھہرے۔ سلیم صاحب کا شکریہ ادا کر کے اور بے دودھ کی چائے فنجانوں میں پی کر چلے آئے۔ ہم سمجھ گئے رحیمو جیسا اچھا پھکیت ہمارے ساتھ ہے۔ یہ عزت افزائی اس کی بدولت ہے۔''

حج تک ہم مکہ ہی میں ٹھہرے رہے، تحفے تحائف کی خرید رحیمو کے ذمہ تھی، وہ دن دن بھر غائب رہتا۔ حرم شریف میں جانے کے وقت وہی ایک ایسا بہادر ہم سب میں تھا کہ اس کا ہر طواف مکمل ہوتا۔ ہم تو بڑی مشکل سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں وہ بھی آدھی رات کے بعد حجر اسود کو چوم سکے۔ لیکن رحیمو کا ہر طواف حجر اسود کی برکتوں سے معمور ہوتا۔ وہ سب کو ڈھکیلتا ہوا کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتا۔ اور کسی نہ کسی طرح چوم لیتا۔ پھر آ کر مجھ سے ملتا اور حرم شریف سے نکل جاتا۔ میرے پوچھنے پر بتاتا کہ ہماری طرف کے ایک صاحب پندرہ بیس برس پچیس برس سے

یہاں رہ رہے ہیں سلائی کا کام کرتے ہیں، ان کے پاس جاتا ہوں۔

حج کے دنوں میں رحیمو برابر ہمارے ساتھ رہا اس سے ہمیں بڑا آرام ملا۔ وہ میرے اور اپنے لیے ایک ایک جوڑا ایسی چپل خرید لایا یا بنوا لایا جو حج کے لیے بہت موزوں تھی۔ منیٰ میں اس کی پہنچ سے ہمیں ایک کمرہ اچھے داموں پر مل گیا۔ قربانی بھی ہم نے آسانی سے کی۔ حج سے فارغ ہونے پر مدینہ شریف جانے کا پروگرام بنایا۔ مدینہ پہونچ کر دس دن ہم نے مسجد نبویؐ میں نمازیں پڑھیں۔ رحیمو بڑی عقیدت سے وہاں رہا۔ کھجوروں کی ذمے داری ہم نے اس کے سپرد کر دی تھی۔ اس نے دو دو ٹین کھجوریں ہم سب کے لیے خریدیں۔ ان پر ٹاٹ چڑھایا۔ چمڑے کے بدھیوں سے ان کو جکڑا، ان پر کول تار سے نام اور پتہ بھی لکھ دیا۔

''ماشاءاللہ رحیمو! تم بہت سمجھ دار ہو۔''

''دعا فرض ہے، اب یہ جہاز کے گودام میں بھی محفوظ رہیں گی۔''

دس دن کے بعد مدینے سے واپسی ہوئی۔ ہم سب جدہ میں ٹھہر گئے۔ تیسرے دن ہمارا جہاز چھوٹنے والا تھا۔ یہ دو دن رحیمو کے لیے بڑی مصروفیت کے تھے، میں نے اس سے کہا ''ارے میاں! اب کہاں بھاگے بھاگے پھرتے ہو اب تو ساتھ رہو۔''

''آج ٹیکسی پر مکہ شریف گیا تھا؟''

''کیوں؟''

''اسمٰعیل صاحب سے ملنے۔''

''وہ جو سلائی کا کام کرتے ہیں؟''

''جی وہی۔ انھوں نے اپنے رشتے داروں کو کچھ سامان دیا ہے۔''

''اچھا، کل کہیں مت جانا۔''

''بہت اچھا۔''

کل آیا تو میں نے رحیمو سے کہا ''بھئی، سامان چوکس رکھو۔'' اس نے کہا کہ سب ٹھیک ہے۔ ملاحظہ فرمالیں۔ میں نے سامان کا جائزہ لیا۔

حج والی چپلوں کے بارے میں کہا ''انھیں یہیں کسی غریب کو دے دو نا۔''

''جی نہیں، یہ تو میں یادگار کے طور پر رکھوں گا۔''

''میں چپ رہا۔''

ٹھیک وقت پر معلم کا وکیل آ گیا۔ اس کے ساتھ ہم جہاز پر جا بیٹھے۔ ہمارا کچھ سامان جہاز کے تاریک گودام میں ڈال دیا گیا۔ ضروری سامان ہماری سیٹ کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ ہمارا جہاز ''سفینہ'' پھر ہمیں سمندر کی موجوں کے ساتھ موجیں کرتا واپس ہو رہا تھا۔ جس دن ہمیں جہاز سے اترنا تھا۔ میں نے رحیمو سے کہہ دیا تھا کہ اب چیکنگ سخت ہونے لگی ہے کوئی سامان ایسا ویسا تو ساتھ نہیں؟ اس نے کہا'' جو آپ نے فرمایا وہ میں نے خرید لیا، اس میں تسبیحیں ہیں۔ اس میں رومال ہیں۔ یہ دیکھیے جانماز ہیں۔ دو آپ کے لیے گھڑیاں لے لی ہیں۔ دو دو ٹین کھجوریں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اور یہ گبھا میں نے ایک بدو سے کمل کے بدلے لے لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں مطمئن ہو گیا۔ اسسٹنٹ کپتان سے رحیمو کا یارانہ واپسی میں بھی رہا۔ بلکہ اب تو رحیمو اس کے لیے بڑا واجب التعظیم ہو گیا تھا۔ الحاج رحیمو تھا، اب اس کے چہرے پر داڑھی کا نور بھی تھا۔ اسسٹنٹ کپتان مدراسی تھا۔ اور دھرم والوں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ آخری دن رحیمو نے ایک تحریر مجھے دکھائی اور کہا دیکھیے اس میں کیا لکھا ہے؟''

تحریر انگریزی میں تھی۔ کسٹم کے ایک ذمے دار کے نام تھی۔ بس یونہی خیریت و خیر صلاح کے بعد لکھا تھا کہ مسٹر رحیمو اور اس کے ساتھ کے لوگ ہمارے (اسسٹنٹ کپتان کے) دوست ہیں۔ میں نے رحیمو سے پوچھا:

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے جواب دیا'' اب اس بے چارے نے دی ہے تو ہمارا کیا حرج ہے۔ آخر کسٹم میں اس سے ملیں گے ہی۔ خط پہنچانا تو ثواب کا کام ہے۔''

میں چپ تو رہا مگر دل میں کھدبد ہونے لگی'' رحیمو نے سونا تو کہیں نہیں چھپایا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کسٹم میں میری نگاہیں نیچی ہوں۔''

لیکن کسٹم کا معاملہ ہمارے لیے بے حد آسان ہو گیا۔ جیسے ہی کسٹم آیا رحیمو نے دور سے ایک شخص کو دیکھا۔ اس کی طرف لپکا۔ اسے جا کر خط دیا۔ وہ شخص اس کے ساتھ چلا آیا۔ میں سامان کے پاس تھا۔ اس نے رحیمو سے پوچھا، کیا کیا سامان ہے آپ کا؟ رحیمو نے اشارہ کیا اور اس نے سب پاس کر دیا۔

سب سے پہلے ہم کسٹم سے پاس ہوئے۔ اب رحیمو نے ممبئی سے جلدی چلنے کے لیے

ضد شروع کردی۔ اسے وطن بری طرح یاد آرہا تھا، وہ ہمیں بندرگاہ سے سیدھا اسٹیشن لا یا۔ اسٹیشن پر عشاء تک ہم پڑے رہے۔ عشاء کے بعد گاڑی ملی۔ ہم اس پر بیٹھے، اب حاجی بنے ہوئے گھر واپس ہو رہے تھے۔ راستے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ لکھنو آ کر گاؤں کو تار دے دیا تھا۔ گاؤں کے اسٹیشن پر استقبال کے لیے لوگ آ گئے۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گجروں اور پھولوں سے لاد دیا گیا۔ ہم گھر پہنچے۔ رحیمو نے سامان اپنے گھر اتارا۔ وہاں سے میرا سامان میرے گھر پہنچا دیا گیا۔ کھجوروں کے ٹینوں سے کھجوریں نکال کر سینیوں میں بھر کر، کشتیوں میں لگا کر بڑے اعزاز کے ساتھ میرے گھر پہنچائیں۔ ہر قسم کی کھجوریں الگ الگ سینیوں اور کشتیوں میں تھیں۔ یہ خرمہ کھجور، یہ حلوا کھجور، یہ کالی کھجور، یہ کلمے والی کھجور اور یہ بے گٹھلی کی کھجور وغیرہ وغیرہ۔

میں رحیمو کے سلیقے سے بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا ''چچا میاں ٹین، ٹاٹ گبھا، چپل اور ایسی چیزیں یادگار کے طور پر میں نے اپنے پاس برکت کے لیے رکھ لی ہیں۔''

''رکھ لو۔'' میں نے کہہ دیا، لیکن پھر کوئی دو مہینے کے بعد میں نے مسجد کے ملا کے پیروں میں حج والی چپلیں دیکھیں تو دیکھتا رہ گیا۔ ملا نے بتایا کہ حاجی رحیمو صاحب نے یہ چپلیں مجھے دی ہیں۔ دو ٹین گبھا اور ٹاٹ مجھے بخش دیا۔ میں نے چپلیں ہاتھ میں لے کر دیکھیں تو مجھے ہلکی محسوس ہوئیں۔ حج کے زمانے میں پاؤں انھیں وزنی محسوس کر رہے تھے۔ جانے ان کے اندر کیا چیز تھی جس کا وزن تھا۔

دو مہینے کے بعد ایک رات الحاج رحیمو گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ بولا ''چچا میاں! رات کی رات اسے رکھ لیجیے۔''

میں نے پوچھا ''اس میں کیا ہے۔'' ''دیکھ لیجیے گا۔'' کہہ کر وہ چلا گیا۔ دوسرے دن اس کے گھر کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ لیکن گھنٹہ بھر کے بعد ہی مطلع صاف ہو گیا۔ اس نے آ کر مجھ سے بتایا ایک ہزار روپے دے کر پولیس سے پیچھا چھڑا لیا۔ میرا تھیلا؟ میں نے تھیلا دے دیا۔ اس نے اس میں سے سونے کی دو سلیں نکالیں مجھے دینے لگا۔ میں نے پوچھا یہ کیا؟ اس نے کہا ''آپ کا حصہ۔''

لاحول ولاقوۃ پڑھ کر میں گھر میں چلا گیا۔ اور اب میں سمجھ گیا کہ مکہ، مدینہ اور جدہ میں اس کی مصروفیات کیا اور کیوں تھیں؟

انتقام

زرینہ کون تھی، کہاں کی رہنے والی تھی۔ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ اسے لوگوں نے اس وقت جانا، جب وہ انور کلب کی ممبر ہوگئی۔ اور پابندی سے کلب کے پروگراموں میں حصہ لینے لگی۔ انور کلب ایک غیر معروف کلب تھا۔ لیکن زرینہ کے ممبر بنتے ہی اس کے اندر بہار آ گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ممبروں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ پہلے جب انور کلب کی ماہانہ میٹنگ ہوتی تو اس کے ممبر اکثر غیر حاضر رہتے، لیکن اب جو نشست ہوئی تو یہی نہیں کہ سارے ممبر حاضر تھے، سب وقت سے پہلے آگئے تھے۔ اور ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ زرینہ سے زیادہ سے زیادہ اپنا تعارف کرا سکے۔

اپنے کو مہذب اور سوشل ثابت کرنے میں زرینہ نے بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ بھی خندہ جبینی سے ملتی۔ مسکرا کر ہاتھ ملاتی، ذرا جھک کر مزاج پوچھتی تو ملنے والے کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا دل زرینہ کے پاس رہ گیا۔ پھر اس کی کشادہ پیشانی، ستواں ناک، بھرے بھرے سیاہ ابرو، بڑی بڑی پلکیں، سرخ وسفید شاداب چہرہ اور اس پر تہذیب جدید کی آرائش، ان تمام اوصاف نے اس کے اندر وہ کشش پیدا کر دی تھی کہ دیکھنے والا اسے دیکھتا رہ جاتا اور جب وہ اس سے مخاطب ہوتی تو فخر محسوس کرتا۔

انور کلب میں سب سے زیادہ لگاؤ اسے مسٹر سیٹھ سے تھا۔ وہ کلب جاتی تو مسٹر سیٹھ کے پاس بیٹھتی۔ کھیلوں میں اس سے قریب رہتی۔ پروگراموں میں اس کی ساتھی بنتی۔ اس کے اور مسٹر سیٹھ کے تعلقات میں روز افزوں اضافہ دیکھ کر دوسرے رشک کرتے۔ مسٹر سیٹھ ایک فرم کے مالک تھے۔ انھوں نے زرینہ کی توجہ کے بدلے روپیہ پیش کیا۔ پانی کی طرح اپنی دولت زرینہ کی فرمائش پر بہائی۔ تھوڑے ہی دنوں میں تعلقات اتنے گہرے ہو گئے، کہ من تو شدم تو من شدی،

کی مثل صادق آنے لگی اور ایک دن جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ مسٹر سیٹھ نے زرینہ کے لیے کوٹھی بنوادی تو یقین ہو گیا کہ اب وہ ان کی ہو گئی۔ لیکن ایک دن جب دیکھنے والوں نے کلب میں زرینہ کو تنہا آتے دیکھا، اس کے ساتھ مسٹر سیٹھ کو نہ پایا۔ اور اس دن مسٹر سیٹھ غیر حاضر رہے تو زرینہ سے ان کی خیریت پوچھی گئی، زرینہ نے صاف صاف بتا دیا کہ مسٹر سیٹھ کی محبت میں خلوص نہ تھا۔ ان کی عمر دیکھیے اور مجھے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا۔

مسٹر سیٹھ کے بعد عزیز صاحب کی قسمت جاگی۔ اب زرینہ سب سے زیادہ عزیز صاحب کی طرف رجوع رہنے لگی۔ عزیز صاحب لکھنو کے نواب خاندان سے تھے، اس گئے گزرے زمانے میں بھی اچھی خاصی جائداد کے مالک تھے، انھوں نے بھی اس کی خواہش کا احترام برقرار رکھا اور دل کھول کر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ اور جب زرینہ ان سے مانوس نظر آنے لگی تو ایک بڑی جائداد اس امید پر اس کے نام لکھ دی کہ اب وہ ان سے شادی کر ہی لے گی۔ اسی امید پر انھوں نے اپنا مدعا اس وقت اس کے سامنے رکھا جب وہ ان کے ساتھ ایک ناؤ میں بیٹھی گومتی ندی کی سیر کر رہی تھی، حرف مدعا سن کر اس نے کل کا وعدہ کر دیا اور پھر یہ کل کا وعدہ اس بے وفا معشوق کا وعدہ جھوٹا ثابت ہوا جس کا رونا اردو ادب کی شاعری میں تمام شعرا روتے چلے آرہے ہیں۔

کلب کے ممبروں نے وجہ پوچھی تو زرینہ نے جواب دیا کہ میں ایسے شخص سے کس طرح شادی کر سکتی ہوں جو ایک بڑے گھرانے کا داماد ہے اور اس کی بیوی موجود ہے۔

عزیز صاحب کے بعد مسٹر حبیب اور مسٹر حبیب کے بعد کھوسلہ، راج، کنور اور بہت سے آسمان زمین بن کر زرینہ کے قدموں کے نیچے آئے، لیکن سب کے ارمانوں کی دنیا میں وہی دن آیا، جب لوگوں نے سنا کہ ان میں سے بھی کسی کی مراد پوری نہیں ہوئی، اور جب لوگوں کو شدہ شدہ یہ معلوم ہوا کہ زرینہ کی ایک نگاہ توجہ کے بدلے بھاری بھاری قیمتیں دینی پڑیں تو آپس میں یہ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ زرینہ کا مقصد اپنے حسن و غمزہ کے بدلے بڑی سے بڑی رقم وصول کرنا ہے، ورنہ وہ کسی کی ہو کر نہیں رہ سکتی اور پھر سب اس سے چوکنا سے ہو گئے۔

ان سب کے بعد ایک نوجوان طالب علم زرینہ کے دام محبت میں گرفتار ہوا۔ اس کا نام شیر احمد تھا، وہ نینی تال کے ضلع کا رہنے والا تھا۔ اور کسی ایسے رئیس کا لڑکا تھا جو کسی وقت کئی گاؤں کا

زمین دار رہ چکا تھا۔ زرینہ سے اس نے اپنا تعارف کرایا تو وہ سمجھ گئی کہ اس نوجوان سے کسی مالی فائدے کی زیادہ امید نہیں، اسی لیے اس نے اس سے بہت جلد تعلقات ختم کر دیے۔ ایک دن جب شیر احمد نے اپنی نوجوانی کی تمام سرمستیوں کے ساتھ اس کے قدموں میں اپنا دل رکھ دیا تو زرینہ نے یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ میں کسی پہاڑی کے ساتھ اپنی زندگی نہیں نبھا سکتی۔

شیر احمد نینی تال سے یہ غرض لے کر آیا تھا کہ وہ یہاں ڈگری لے۔ لیکن یہاں آ کر دوسری ڈگری لینے میں پڑ گیا۔ اور جب یہ دوسری ڈگری حاصل نہ کر سکا تو اسے پہلی ڈگری بھی برباد ہوتی نظر آئی۔ وہ ناامید ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ بند کمرے میں اس نے دو خط لکھے۔ ایک زرینہ کے نام دوسرا اپنے والد کو۔ زرینہ کو اس نے لکھا کہ وہ محبت میں ناکامی کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ باپ کو پوری داستان من وعن لکھ دی۔ اس نے باپ کو خط لکھتے ہوئے یہ معذرت بھی کی کہ آپ کا بیٹا یہاں آ کر وہ کچھ نہ بن سکا جو آپ چاہتے تھے۔ لہٰذا اب وہ آپ کو منھ دکھانے کے لائق نہیں۔

دونوں خط لکھ کر اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ باہر نکلا، جا کر خود لیٹر بکس میں ڈال آیا۔ واپس آ کر کمرے میں گیا اور پھر پستول کے ایک دھماکے سے بورڈنگ ہاؤس کی فضا میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اور پھر یہ کہ جب پولیس آئی تو شیر احمد کی میز پر اس کا لکھا ہوا ایک پرزہ پایا گیا۔ لکھا تھا ''میں محبت میں ناکام ہو کر خودکشی کر رہا ہوں۔''

زرینہ کو ایسے جاں باز عاشق سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ اس حادثہ کو اس نے بھی سنا۔ اس نے ذرا جھرجھری لی۔ کچھ رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے۔ پھر عجیب وغریب اور حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ اسی مہینے میں اس نے مسٹر شجاعت علی خاں سے ایک معمولی تعارف کے بعد شادی کر لی۔ مسٹر شجاعت علی خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اولاد کوئی نہیں تھی اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ کہ زرینہ نے کلب کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ باقاعدہ ایک فرماں بردار بیوی کی طرح کپتان صاحب کے ساتھ رہنے لگی۔ سال کے اندر خدا نے اس کی گود بھری۔ ایک نہایت خوب صورت بچہ اس کی گود میں کھیلنے لگا۔ وہ ایک اچھی ماں کی طرح اس کی پرورش کرنے لگی۔ یہاں تک کہ بچہ دو برس کا ہو گیا۔ اس عرصے میں وہ کپتان صاحب سے بے حد محبت کرنے لگی تھی، بے لوث محبت۔ ایسی محبت جیسی ایک بیوی کو واقعی اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔ یہ ردعمل واقعی حیران کن تھا۔

انہی دنوں میں خبر آئی کو ضلع نینی تال میں دلیر خاں ڈاکو نے سخت دہشت پھیلا رکھی ہے۔ وہاں کی پولیس مجبور محض ہے۔ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں آتا۔ اخبارات نے ان وارداتوں کو خوب رنگ دیا۔ اور ان سے جہاں تک ہو سکا پولیس کو خوب بدنام کیا، آخر پولیس نے دلیر خاں ڈاکو کو پکڑنے کا حتمی ارادہ کر لیا۔ مسٹر شجاعت علی خاں اپنے پچھلے کارناموں کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کو حکم ملا کہ وہ اپنے کارموں میں ایک کارنامے کا اور اضافہ کریں۔

کپتان شجاعت علی خاں کو یہ حکم ملا۔ تو زرینہ ضد کرنے لگی کہ وہ بھی ساتھ جائے گی، وہ ان کے بغیر ایک منٹ تنہا نہیں رہ سکتی۔ کپتان صاحب نے اسے بہت سمجھایا، خطروں سے آگاہ کیا۔ مگر وہ نہ مانی۔ پھر جب کپتان صاحب لیس ہو کر چلے تو وہ بھی شوہر کے ساتھ تھی اور بچہ بھی۔ کپتان صاحب نے اپنی روانگی کو پوشیدہ رکھا۔ انہوں نے ضلع نینی تال کے ایک معروف تھانے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے لیے سوچا تھا۔ وہ لکھنو سے عام مسافروں کے لباس میں ٹرین سے روانہ ہوئے۔ رام پور آکر کوتوالی گئے، کوتوال سے ملے۔ اپنا تعارف کرایا۔ مقصد بتایا۔ اسٹاف کے لوگوں کو بتایا گیا کہ کوتوال صاحب کے ایک پرانے دوست فیملی کے ساتھ ملنے آئے ہیں تو انہوں نے خاطر تواضع میں خوب حصہ لیا۔ اس کے بعد ایک جیپ پر اس انداز سے چلے کہ نینی تال پر سورج ڈھلنے سے پہلے پہنچ جائیں۔

نینی تال روڈ پر جیب فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر شجاعت علی خاں نے ذہن میں طریق کار کا جو نقشہ بنایا تھا وہ اس کے خطوط درست کرنے میں لگ گئے۔ بیوی کو سمجھا دیا تھا کہ اب وہ راستے میں بات نہ کرے۔

نصف سے زیادہ فاصلہ طے ہو چکا تھا کہ ایک جگہ جیپ جھٹکا کھا کر رک گئی، جیپ ڈرائیور کانسٹیبل تھا اس نے اتر کر دیکھا۔ اس نے کہا صاحب آپ بیٹھے رہیں ذرا خرابی آگئی ہے، ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ معاف فرمائیں۔ کوتوال صاحب سے کچھ نہ کہیے گا۔

اس نے کچھ پرزے کھولے اور فٹ کیے۔ لیکن اس کو دھیرے دھیرے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اور پھر بھی گاڑی چلنے کے لائق نہ بنا سکا۔ اس عرصے میں کپتان نے کئی بار اس سے پوچھا، کیا کسر رہ گئی، اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ بس ٹھیک ہو رہی ہے۔

مگر جیپ کو نہ ٹھیک ہونا تھا، نہ ٹھیک ہو سکی تو کانسٹیبل ڈرائیور نے اپنے افسر مہمان سے

کہا ''اگر آپ کہیں تو کسی آنے جانے والی کار کو روکوں اور اس سے آپ کو روانہ کر دوں۔ گاڑی نہ جانے کب درست ہو اور آپ کو دن ہی دن میں پہونچنا ہے۔''

کپتان صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد پیچھے سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ کانسٹیبل ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ کار رکی۔ اس پر ڈرائیور کے علاوہ ایک شریف صورت بزرگ بیٹھے تھے۔ بڑی سی داڑھی مونچھ پچاس سال سے زائد۔ انھوں نے کار سے سر نکال کر ایک شریف انسان ایک خاتون اور بچے کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر اترے۔ کانسٹیبل نے ان سے استدعا کی، ''یہ صاحب کپتان صاحب کے دوست ہیں۔ نینی تال کی سیر کو جا رہے ہیں۔ ہماری جیپ خراب ہوگئی ہے۔ آپ اپنی کار پر آگے بیٹھ جائیں اور پچھلی سیٹ ان کے لیے خالی کر دیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ اپنا تعارف کرائیں تاکہ میں آپ کی مہربانی کا تذکرہ کوتوال صاحب سے بھی کروں۔''

وہ بزرگ کچھ نہ بولے۔ ایک نظر ان پر ڈالی اور خاموشی سے اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ''یہ ہمارا فرض ہے کہ شریف آدمی کے کام آئیں۔ خاص کر اس وقت جب کہ ایک شریف خاتون اور اس کا بچہ اس کے ساتھ ہو۔''

ان الفاظ میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ کپتان شجاعت علی خاں صاحب اس پیش کش کو رد نہ کر سکے۔ یا پھر یہ کہ وہ اس وقت مجبور تھے۔ بیوی بچے اور اپنے سامان کو لے کر کار میں جا بیٹھے۔ پچھلی سیٹ ان کے اور ان کے بال بچوں کے لیے کافی تھی۔

کار آگے چل دی۔ سب اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ کپتان صاحب پھر سوچنے لگے۔ ان بزرگ نے مزاج سے واقفیت حاصل کیے بغیر بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ڈرائیور کی نظر سامنے تھی۔ وہ کبھی کبھی دائیں بائیں اور پیچھے اچٹتی نظر ڈالتا جاتا تھا۔ اور بس۔ کار رواں دواں تھی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ دیر ہو چکی تھی۔ راستے ہی میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ کچھ سوچ کر کپتان صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا: ''کتنی دیر اور لگے گی؟''

''بس آ گئے، آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟''

ڈرائیور کے اس سوال کا جواب دینا کپتان صاحب کو بڑا مشکل معلوم ہوا۔ وہ اپنے کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے، کچھ سوچ کر بولے: ''کسی ہوٹل میں لے چلو۔''

"آپ اجنبی مسافر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی تکلیف نہ ہو تو غریب خانہ حاضر ہے۔"
ان بزرگ نے پیش کش کی۔ کپتان صاحب نے ان کی پیش کش پر شکریہ تو ادا کیا لیکن قبول نہیں کیا۔
"بہت بہتر!"

ڈرائیور نے ایک موڑ سے کار دوسری طرف گھما دی۔ کچھ کچھ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسی اندھیرے میں کار شریف ہوٹل کے سامنے رکی۔ کپتان صاحب کا سامان اتارا گیا، اور پھر معمولی سلام وکلام کے بعد ڈرائیور کار اور اپنے مالک کو لے کر ایک طرف چلا گیا۔

شریف ہوٹل میں کپتان صاحب ایک کمرے میں ٹھہرے۔ وہیں کھانا کھایا پھر ہوٹل کے مالک سے ٹیلی فون طلب کیا۔ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ کپتان صاحب ٹیلی فون کے کمرے میں پہنچے۔ اپنی نوٹ بک نکالی نینی تال کے پولیس اسٹیشن کے نمبر دیکھے، نمبر ملا کر "ہلو ہلو" کرنے لگے۔ دوسری طرف سے جواب نہ پا کر رکے۔ ایک سگریٹ جلا کر پینے لگے۔ اس کے بعد پھر فون کا اعادہ کیا۔ اس بار بھی جواب نہ پا کر سمجھ گئے کہ اس میں کچھ خرابی ہے۔ وہ اٹھے اور چاہا کہ کمرے سے باہر جائیں، مگر کواڑ باہر سے بند پا کر کھٹکے۔ اس وقت انھیں محسوس ہوا کہ کمرے میں ایک طرح کی خوشبو پھیلی ہے۔ اور ان کے قویٰ ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔ وہ آ کر پھر کرسی پر بیٹھ گئے اور بے ہوش ہو گئے۔

یہاں زرینہ اپنے بچے کے ساتھ ان کا انتظار کر رہی تھی۔ دیر ہوئی تو اٹھی، چاہا کمرے سے نکل کر دیکھے، کہاں چلے گئے۔ لیکن اسی وقت اس کمرے کی عقبی دیوار کا دروازہ کھلا۔ آہٹ پا کر وہ مڑی، اس نے دیکھا وہی بزرگ، جن کی کار پر وہ آئی تھی اس دروازے سے کمرے میں آ رہے تھے۔

"آپ! آپ یہاں کیسے......؟" زرینہ نے تعجب آمیز لہجے میں کہا۔

"میں یہاں کیسے آیا؟ ابھی عرض کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ بزرگ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ آپ بھی تشریف رکھیں، اور کمرے سے باہر جانے کی تکلیف نہ فرمائیں۔

"کیوں؟"

"آپ باہر نہ جاسکیں گی، دروازے باہر سے بند ہیں۔"

"مگر اجازت کے بغیر میرے کمرے میں آپ کا آنا صحیح نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"جان بوجھ کر آپ نے غلطی کی، اس طرح تو جرم اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔"
"یہ بھی جانتا ہوں۔"
"آپ میرے کمرے سے نکل جائیے!"
"آپ عورت ذات ہیں ذرا نرمی سے بات کیجیے۔"
"آپ جانتے ہیں میں کس کی بیوی ہوں۔"
"میں جانتا ہوں، آپ کپتان شجاعت علی خاں صاحب بہادر کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں، میں زرینہ صاحبہ سے مخاطب ہوں۔"
یہ تعارف سن کر زرینہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ صاحب اس سے کس طرح واقف ہوئے۔
"اور آپ کون ہیں؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔
"میں آپ کو زیادہ دیر حیران رکھنا پسند نہیں کرتا۔ پہلے آپ یہ فرما دیں کہ لکھنو کا نوجوان طالب علم شیر خاں آپ کو یاد ہے۔"
"شیر خاں! شیر خاں!" وہ بوکھلا گئی۔
"میں شیر خاں کا باپ ہوں۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔"
زرینہ سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ اسے کیوں دھوکہ دیا گیا۔ اس نے دل میں کہا کہ انتقام کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ جان دینے کے لیے اپنے کو تیار کرنے لگی۔ اس نے کہا:
"آپ کا بیٹا شیر خاں ایک اَحمق لڑکا تھا۔ وہ محبت کے معنی نہیں جانتا تھا۔ ہوس کو محبت سمجھا اور بری طرح ناکام ہونے پر خودکشی کر بیٹھا۔"
"آپ نے لفظ الٹ دیے۔ یوں کہیے کہ وہ محبت کو ہوس سمجھا۔ اس نے محبت کا تحفہ ہوس کے سامنے پیش کیا۔ وہ ہوس کو کوٹھی نہ دے سکا، بنگلہ نہ دے سکا، جائداد نہ دے سکا۔ اس کے پاس صرف جان تھی۔ اس نے جان دے دی، لیکن وہ تو میری جان تھا، اس میں میری جان تھی۔ آپ میری جان مجھے واپس دیں، تب ہی یہاں سے جا سکتی ہیں۔"
زرینہ نے دیکھا کہ اس بوڑھے کی آنکھوں میں موتیوں جیسی چمک پیدا ہوئی۔ وہ سمجھ گئی

کہ یہ موتی نہیں، آنسوؤں کے قطرے ہیں۔اس نے کہا:

''شیر خاں کی جان تو اب واپس نہیں آسکتی، آپ اس کے بدلے میں جان لے سکتے ہیں۔''

''بشرطیکہ آپ کے اندر آپ کی جان ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''ابھی بتاتا ہوں!''

یہ کہہ کر بوڑھے نے تالی بجائی۔فوراً کمرے کا باہری دروازہ کھلا۔دو آدمی لوہے کی سلاخیں لیے ہوئے اندر داخل ہوئے۔سلاخوں کی نوکیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے ابھی ابھی آگ کے اندر سے نکالی گئی ہوں۔

''کھڑی ہو جاؤ۔'' بوڑھے نے حکم دیا۔زرینہ کھڑی ہوگئی۔

''اس بچے کو مجھے دو۔''

''تم بچے کو کیا کرو گے؟''

''خوب، لہجہ بدل گیا، میں ان سرخ سلاخوں سے بچے کی دونوں آنکھیں پھوڑ وادوں گا۔''

''آپ ایسا نہیں کر سکتے۔''

اس پہاڑی علاقے میں آپ کے شوہر کا حکم نہیں چلتا، دلیر خاں کا حکم چلتا ہے۔آپ کو معلوم نہیں یہاں کے تھانے ہیں تو سرکاری، لیکن کرتے وہ ہیں جو میں کہتا ہوں، یہاں کے کانسٹیبل میرے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔وہ کانسٹیبل بھی میرا حکم بردار تھا جس کی جیپ پر آپ تشریف لا رہی تھیں۔

''تو آپ دلیر خاں ڈاکو ہیں۔''

''نہیں! میں شیر خاں کا باپ ہوں۔تین سال ہوئے جب میرے بیٹے نے مجھے آخری خط لکھا تھا۔اس وقت سے میں تاک میں تھا۔دلیر خاں سے دلیر خاں ڈاکو بن گیا۔فرضی ڈاکے ڈلوائے، کسی کی جان نہیں لی۔اخباروں میں خوب شہرت کرائی۔پھر میں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ شجاعت علی خاں میرے مقابلے کو بھیجے گئے جو ٹیلی فون کے کمرے میں میٹھی نیند سو رہے ہیں۔''

''میٹھی نیند، کیا تم نے انھیں.........''

''نہیں وہ صرف بے ہوش ہیں، تم گھبرا کیوں گئیں۔''

''وہ میرے پیارے شوہر ہیں۔''

''تو کیا زرینہ کے جسم میں کوئی بیوی بھی موجود ہے۔''

''کیوں نہیں۔''

''اچھا تو یہی سہی!''

بوڑھے نے اپنے دونوں آدمیوں سے کہا'' جاؤ پہلے کپتان صاحب کی آنکھیں پھوڑ دو۔''

''نہیں، تم ایسا مت کرو، جان کا بدلہ جان مجھ سے لو۔''

''اری جھوٹی، تیری جان تو تیرے شوہر اور تیرے بیٹے میں ہے۔ مجھے وہی چاہیے۔ مگر میں پہلے اس کا ثبوت لے لوں۔''

بوڑھے نے اپنے ساتھیوں سے کہا'' پھوڑ دو اس کی آنکھیں۔''

یہ سن کر زرینہ نے بیٹے کو ایک طرف کر دیا۔ دو برس کا بچہ ہکا بکا ہو کر یہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ زرینہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لو ان آنکھوں کی قربانی؟

آگ کی دو سلاخوں کی طرح انگارہ نوکیں اس کی آنکھوں سے قریب ہونے لگیں۔ قریب قریب یہاں تک کہ سلاخوں کی نوکوں اور زرینہ کی آنکھوں کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا۔ دلیر خاں نے دیکھا کہ زرینہ نے پلک نہیں جھپکائی۔

''ٹھہرو!'' دلیر خاں نے حکم دیا۔ وہ سلاخیں رک گئیں۔

''بے شک تیری جان تیرے اندر نہیں ہے۔'' بوڑھے دلیر خاں نے کہا۔ پھر اس نے لڑکے کو پکڑ کر کہا:

''دونوں سلاخیں اس کے سینے کے پار کر دو۔''

''نہیں، خدا کے لیے نہیں، تم میرے بچے کو نہیں مار سکتے۔'' زرینہ بدحواس ہو کر بچے کے آگے کھڑی ہو گئی۔''

''میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''کیوں نہیں زندہ رہ سکتیں۔''

''وہ میرا بچہ ہے۔''

''اور شیر خاں بھی تو میرا بچہ تھا۔''

''تو کیا میرے بچے کی جان لے کر تم شیر خاں کو زندہ کر سکتے ہو۔''

''مجھے برابر کا انتقام لینا ہے۔''

''اس انتقام سے تمہارے دل سے بیٹے کا غم دور ہو جائے گا؟''

''غم! آہ اس کا غم تو قبر تک ساتھ نہ چھوڑے گا۔''

''پھر بھی تم دوسروں کو بھی اپنا جیسا بنا دینا چاہتے ہو۔''

''ہائیں! یہ باتیں!'' بوڑھا ذرا دیر کے لیے رکا، اس نے ماتھے کا پسینہ پوچھا۔ پھر زرینہ کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر گھورنے لگا۔ پھر آپ ہی آپ بولا:

''اس کی نگاہیں تو کہتی ہیں کہ یہ اب وہ زرینہ نہیں ہے جس سے میں انتقام لینا چاہتا تھا۔ اب تو اس کے جسم میں ایک بیوی ہے اور ماں بھی۔ جب تک یہ عورت بیوی ہے، ماں ہے، اسے زندہ رہنا چاہیے۔ جاؤ جاؤ۔ تم سب آزاد ہو۔''

شیر خاں کے والد دلیر خاں صاحب جس دروازے سے آئے تھے، اسی سے پھر چلے گئے۔

دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ پولیس کار پر بیٹھے نینی تال سے واپس ہو رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی زرینہ تھی۔ ان کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے کارناموں کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

ضلع نینی تال میں امن ہونے سے ان کے کارناموں میں ایک کارنامے کا اور اضافہ ہو گیا۔ لیکن یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک دن میں یہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اور کیسے ہو گیا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ زرینہ ہر سال اپنے بچے کو لے کر گرمیوں میں نینی تال جاتی اور دلیر خاں کی مہمان بنتی تھی۔ اور جب وہاں سے واپس آتی تو اس کے ساتھ اس کے اور اس کے بچے کے لیے ڈھیروں تحفے ہوتے۔

نگیں

یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ شکیب صاحب صحت یاب ہو کر آ گئے۔ شکیب صاحب میرے استاد تھے۔ ہمارے کالج میں سارے استادوں سے زیادہ محنتی، سنجیدہ اور باوقار استاد وہی تھے، آج کل طلباء کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن شکیب صاحب کی عزت بھی کرتے تھے۔

اور یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ شکیب صاحب اسپتال سے صحت کے ساتھ ایک عدد بیوی بھی لائے ہیں۔ ''یقیناً وہ کوئی نہایت خوب صورت ڈاکٹرنی ہوگی۔'' اچانک میرے دل نے کہا اور میں فوراً اپنے استاد سے ملنے چل دیا۔ راستے میں شکیب صاحب کے متناسب جسم اور گورے چٹے رنگ کو نظر میں رکھتے ہوئے ڈاکٹرنی کی ہیئت تخلیق کرتا رہا۔

شکیب صاحب جیسے حسین و جمیل اور باوقار سنجیدہ شخص کا انتخاب ضرور غیر معمولی ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ قد میں شکیب صاحب سے دو تین انچ کم ہی ہوگی۔ یہی اندازاً پانچ فیٹ ایک یا دو انچ۔ لیکن حسن کے دوسرے اوصاف میں اگر وہ انہی جیسی ہوئی تو بھی نسائی نزاکتوں اور لطافتوں نے اسے اندر لوک کی اپسرا یا کوہ قاف کی پری بنا دیا ہوگا۔ ورنہ شکیب صاحب کاہے کو اسے رفیقۂ حیات بناتے۔ رنگ اور روپ کا اندازہ کرنے میں مجھے وقت تو ہوئی کیونکہ شکیب صاحب خود رنگ اور روپ میں اپنی مثال آپ تھے۔ اوہ...... میں سمجھ گیا۔ بے عیب خدا کی ذات ہے۔ شکیب صاحب کی باچھیں ذرا کھلی ہوئی ہیں۔ اور ڈاکٹرنی غنچہ دہن ہوگی۔ اور اگر اس کے گورے چٹے رنگ میں اس کے خون نے گلابی بھر دی ہوگی تو واقعی وہ غیر معمولی حسین ہوگی۔

پھر اگر کلاں راس گھوڑے کی طرح گردن، کشمیر حسینہ کی طرح ستواں ناک اور قاف کی پریوں کی طرح کتابی چہرہ ہوگا تو؟ تو کہنا چاہیے کہ خدا نے اسے اپنے ہاتھ سے بنایا ہوگا۔ اور عمر؟

ہاں، عمر تو زیادہ ہی ہوگی۔ مگر شکیب صاحب ایسے نادان نہیں کہ خود جوان ہوتے ہوئے گرتی دیوار کا سہارا لیں گے۔ اور آنکھیں؟ وہ تو نرگسی ہوں گی ہی۔ کیونکہ شکیب صاحب کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ یورپین عورتوں کو محض نیلی آنکھوں کی وجہ سے حسین نہیں کہتے تھے۔ نگاہوں میں بلا کی کشش اور بجلی کی سی چمک ہوگی۔ شکیب صاحب کی نگاہوں میں چمک کیا کم ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے۔ جس وقت دونوں کی نگاہیں ٹکرائی ہوں گی تو دو دلوں کو ملانے والے کاتب تقدیر نے یہ شعر ضرور نوٹ کیا ہوگا۔

طوفان بجلیوں کا اٹھا جلوہ گاہ سے
کس کی نگاہ لڑ گئی کس کی نگاہ سے

اور میں ایک شخص سے ٹکرا کر اگر دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو نالی میں لت پت ہونے میں شک ہی نہ تھا۔ معاف کیجئے گا، کہہ کر اور جس شخص سے ٹکرایا تھا اس کی خشمگیں نگاہوں کو دیکھ میں جھٹ آگے بڑھ گیا۔ گھبراہٹ میں وہ ہیولہ میرے ذہن سے غائب ہو چکا تھا جو میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے دماغ میں بناتا چلا آ رہا تھا۔ لاحول ولاقوۃ۔ اگر اس وقت کسی ٹرک کے نیچے آ جاتا تو بھرکس ہی نکل گیا ہوتا۔ میں مسکرایا۔ شکیب صاحب کا دولت کدہ قریب آ گیا تھا میں نے دل میں اپنے کو ذرا باوقار۔ نہیں باوقار نہیں سنجیدہ۔ سنجیدہ بھی نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا! کہ فلاں شخص اپنے کو ''لیے دیئے'' رہتا ہے۔ میں نے اپنے چہرے کو ایسا ہی بنالیا۔ پھر سوچا لوگ غیر معمولی حسین و جمیل کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو، آفتاب اور ماہتاب کو ایک جگہ دیکھ کر میں گم صم ہو جاؤں اور دونوں کی نظروں میں حقیر ٹھہروں تو پھر میں نے کوشش کر کے اپنے کو مجسم ''لیے دیئے'' بنالیا۔ دروازے پر جا کر کھڑا ہوا۔ کال بیل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ میں رک گیا، اور پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں واقعی ''لیے دیئے'' بن گیا ہوں تو بٹن دبا دیا۔ میرا خیال تھا کہ گھنٹی ٹن ٹن ٹن یعنی زور سے بجے گی۔ لیکن آواز کچھ ایسی پیدا ہوئی جیسے اندر کوئی راگ گونج گیا ہو، میں اپنے کو سنبھال کر انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ نہیں ہوا تھا کہ آہستہ سے کواڑ کا ایک پٹ کھلا۔ میرے سامنے ایک سانولی پوری جوان عورت، یہی کوئی چوبیس برس کے لگ بھگ نہایت سادہ لیکن نہایت سادہ صاف ستھرا اجلا لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا۔

''شاید آپ طالب علم ہیں؟''

''جی ہاں! کیا ماسٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں؟''

''ابھی ابھی بازار گئے ہیں۔ ابھی ابھی آتے ہیں۔ میں کمرہ کھولتی ہوں اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی۔''

اور وہ کمرہ کھولنے چلی گئی۔ ''ماشاء اللہ! کس قدر مہذب اور قیافہ شناس خادمہ ہے۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ طالب علم ہوں۔ پھر زبان کس قدر رشستہ وشگفتہ۔ جب خادمہ ایسی ہے تو مالکہ کیسی ہوگی۔ میں نے دل میں دعا کی، اللہ! آج میری تہذیب اور زبان کی لاج رکھ لے۔''

''تشریف لائیں!'' کمرے کے کواڑ کھل چکے تھے۔ خادمہ نے دروازے سے باہر نکل کر کہا۔ اور میں ادھر جا کر کمرے میں داخل ہوگیا۔ بارہ فیٹ مربع کمرے میں صوفہ سیٹ، اس کے سامنے ڈیڑھ فیٹ اونچی ہلکی سی میز، میز پر سفید موٹا سا میز پوش جس کے کونوں پر صرف گلاب کا ایک ایک پھول کڑھا ہوا تھا۔ اور صوفہ سیٹ کے ٹھیک سامنے دیوار پر ہلکے ہلکے رنگوں والا ایک کلنڈر ٹنگا تھا۔ بس یہی سادگی کمرے کی مکمل زینت تھی۔ خادمہ نے کہا ''تشریف رکھیں!'' میں بیٹھ گیا۔

''میرا اسلام کہہ دیجیے گا۔''

''عرض کیا نا! ابھی تشریف لاتے ہیں۔''

''نہیں، میرا مطلب ہے، اندر......... '' اور میں کہتے کہتے رک گیا۔

''اندر کسے؟'' اس نے وضاحت چاہی۔

''یعنی ہمارے ماسٹر صاحب کی......... اور میں نے پھر زبان روک لی۔ وہ مسکرائی۔

''اچھا میں سمجھ گئی۔''

باہر کسی نے پھر کال بیل دبائی۔ اور پھر راگ گونجا۔

''لیجیے آپ کے ماسٹر صاحب آگئے۔ آپ کا اسم گرامی؟''

''جواد!''

اچھا نام ہے، کہہ کر وہ دروازے کی طرف چلی گئی۔ اور میں حسین وجمیل، باوقار، سنجیدہ اور نئے شادی شدہ استاد سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کے لیے اپنے کو تیار کرنے لگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ابھی تک ''لیے دیے'' تھا۔

ماسٹر صاحب کو آئے کچھ بھی دیر نہ لگی۔ وہ صحن میں آ کر سیدھے کمرے میں آ گئے۔ میں آہٹ پاتے ہی کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ شکیب صاحب نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ پاس بٹھایا۔ بڑی خندہ جبینی سے باتیں کرنے لگے۔ خیریت اور خیر صلا کے بعد میں نے شادی خانہ آبادی کی مبارک باد پیش کی۔ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ ''تم اپنی استانی سے ملے بھی!'' انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ خادمہ سے سلام تو کہلوا دیا تھا۔

''خادمہ!......... خادمہ کون؟''

''یہی، یہ جو کہا......... '' اور میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے ادھورا جملہ چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

''یہی تو ہیں۔ اچھا تعارف کرا دوں۔'' پھر ماسٹر صاحب کمرے کے اس دروازے کی طرف گئے جو صحن میں کھلتا ہے۔ ارے بھئی، نگیں! چائے لانا! اور یہ کہہ کر پھر میرے پاس آ بیٹھے، اور میرا یہ عالم گویا میں کمرے میں تھا ہی نہیں۔

''خدایا! کیا وہی جسے میں خادمہ سمجھا۔''

''یہ لو جواد، سلام کرو۔'' ماسٹر صاحب نے آہٹ پا کر مجھ سے کہا۔

وہی جسے میں خادمہ سمجھے ہوئے تھا، خوب صورت ٹرے میں چائے لائی۔ مجھ پر نظر ڈال کر مخاطب ہوئی ''اچھے ہو جواد!''

''جی.......... !'' اب میں سنبھلا۔ میں نے سلام کیا۔ ماسٹر صاحب مسکرا رہے تھے۔

''بس اک ذرا، ایک منٹ!'' اور یہ کہہ کر میرے استاد کی یہ رفیقۂ حیات پھر اندر تشریف لے گئیں۔ اور وہاں سے دو سیب اور ایک چھوٹی سی خوب صورت چھری ایک بالشت کی گول ٹرے نہیں، ٹریچہ میں رکھ کر لائیں۔ ماسٹر صاحب بازار سے دو ہی سیب لائے تھے، ایسے بے داغ اور یک رنگ سیب کہ میری زبان سے ''واہ'' نکل گئی۔ میری نظریں بیک لمحہ اس نئے جوڑے پر پڑیں جن میں سے ایک تھے شکیب صاحب اور دوسری تھیں محترمہ نگیں صاحبہ

اس میں شک نہیں کہ جب تک میں وہاں رہا، زبان و بیان کے اعتبار سے بے شک محترمہ کے منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ بے شک کلام کرتے وقت وہ موتی برساتی تھیں۔ بے شک ان کی نگاہوں میں بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ بے شک وہ انتہائی شستہ اور شگفتہ زبان خاتون تھیں۔ لیکن میں ماسٹر صاحب کے اس ''سانولیا'' انتخاب پر انھیں خوش نصیب نہیں کہہ سکا۔

تھوڑی دیر بادل ناخواستہ بیٹھ کر میں نے اجازت چاہی۔ دونوں نے ہنس مکھ چہروں کے ساتھ رخصت کیا۔ پھر آنے کا وعدہ لیا۔ میں نہ جانے کیا سوچتا ہوا واپس ہوا۔ راستے میں شوکت ملا۔ پوچھنے لگا۔ ''کہاں سے آرہے ہو۔'' میں جھلایا ہوا تھا ہی، جواب دیا ''بھاڑ سے۔'' مسخرے شوکت نے کہا'' اسی لیے بھنے بھنے سے لگتے ہو۔'' اور پھر جب میں نے اسے بتایا کہ استاد صاحب اور محترمہ استانی جی سے مل کر آرہا ہوں، تو شوکت بولا'' استانی جی؟ یہ کہو کہ سروجنی نائیڈو سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔''

سروجنی نائیڈو کی تشبیہہ پر میں پھڑک اٹھا۔ محترمہ نگیں صاحبہ کو دیکھنے اور سننے کے بعد ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ وہ طوطی شاعرہ دربار نظام مسز سروجنی نائیڈو ہی تھیں۔ اور پھر میری سمجھ میں آگیا کہ شکیب صاحب محض تہذیب اور زبان کی شائستگی کی وجہ سے آج کی سروجنی نائیڈو کو دل دے بیٹھے، جس پر کالے نمک کی پہاڑن کی پھبتی بھی چسپاں ہوسکتی ہے۔

لیکن جب میں اپنے انگریزی کے ٹیچر مسٹر فش سے ملا تو رائے بدلنی پڑی۔ دراصل نگیں صاحبہ نے شکیب صاحب کے دل پر شستہ زبانی اور شگفتہ بیانی کا نقش نہیں بٹھایا تھا۔ شکیب صاحب کا دل جیتنے کا سبب کچھ اور تھا۔ مسٹر فش نے مجھے بتایا کہ جب شکیب صاحب اسپتال میں داخل ہوئے تو مس نگیں یعنی مسز شکیب وہاں نرس تھیں۔ اس وقت انھوں نے دن رات ایک کر کے شکیب صاحب کی خدمت کی۔ اگر وہ اپنا صرف فرض انجام دیتیں تو رات کے چھ گھنٹے پورے کر کے وارڈ سے چل دیتیں، اور دوسری نرس بملا کے لیے ڈیوٹی چھوڑ دیتیں۔ لیکن نہیں۔ فرض سے بڑھ کر کام کیا۔ وہ آدھی آدھی رات تک وارڈ میں رہتیں، اور جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ شکیب صاحب صبح تک آرام سے سوئیں گے، نظریں ان پر سے نہ ہٹاتیں۔

کامل دو ماہ انھوں نے اپنے کو شکیب صاحب پر نچھاور رکھا۔ ڈاکٹروں، کمپاؤنڈروں اور نرسوں کو یقین تھا کہ شکیب صاحب کے ملنے والوں نے خود انھوں نے ضرور بڑی سی رقم بخشش میں پیشگی دے دی ہے۔ بملا نے کئی بار پوچھا بھی، آج تم کو کیا ملا؟ مجھے پانچ کا نوٹ دیا ہے۔ اس کے جواب میں کہہ دیتیں کہ میں تو اکٹھا لوں گی۔

''احمق پھر کون دیتا ہے۔'' مس نگیں پر طنز کیا جاتا، لیکن واقعی کیا کوئی ایسی دیکھ بھال اور خدمت کرے گا۔ کئی موقعے ایسے آئے جب بملا نے شکیب صاحب کی طرف سے منھ پھیر

لیا۔ ایسے نازک اوقات میں جب بھائی بہن کے پاس سے ہٹ جاتا ہے۔ اور بہن بھائی کے پاس سے ایسے نازک اوقات میں جب ماں باپ اولاد کے پاس سے ہٹ جاتے ہیں اور اولاد ماں باپ کی خدمت کرنے سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جی! ایسے نازک اوقات میں فطرت کے خلاف مس نگیں نے شکیب صاحب کو سہارا دیا۔

دو ماہ سے زائد فرض منصبی سے بڑھ کر تیمارداری کرنے کے بعد جب شکیب صاحب صحت یاب ہوئے تو مس نگیں سے بولے ''تم نے کبھی کچھ نہیں لیا۔ اب میری خواہش ہے کہ اپنی خواہش بیان کرو۔ کیا چاہتی ہو۔ تم نے میری جو خدمت کی ہے۔ اس کا معاوضہ میں نہیں دے سکتا۔ لیکن چاہتا ہوں کہ تم سے ہی پوچھ لوں کہ تم کیا چاہتی ہو؟''

مس نگیں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ خود کس شکل وصورت کی ہیں اور شکیب صاحب کیسے چندے آفتاب وچندے ماہتاب، مگر جیسے پہلے سے تیار اور طے کیے بیٹھی تھیں۔ فوراً کہہ دیا۔ ''میں آپ کو چاہتی ہوں''

''بہتر ہے۔ شکیب صاحب کی زبان سے نکلا'' سنجیدگی کے ساتھ تو اپنا سامان لو، اسپتال چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔''

اس مختصر بات چیت کے بعد شکیب صاحب مس نگیں کو گھر لائے۔ ہم سب کو بلا بھیجا۔ میں بھی گیا تھا۔ ہندو مسلم سبھی ٹیچر گئے تھے۔ گھر پر اور بھی سفید پوش جواں سال اور بزرگ عمر کے لوگ موجود تھے۔ سب کے سامنے مس نگیں کو پہلے کلمہ پڑھوا کر مسلمان کیا۔ اس کے بعد سب نے سنا کہ شکیب صاحب کہہ رہے تھے۔ ''قبول کیا میں نے۔''

لیجیے مس نگیں مسز شکیب ہوگئی۔ شکیب صاحب کا بیان ہے کہ میری نظر میں نگیں سے بہتر دوسری عورت نہیں۔ میری نظروں سے کوئی دیکھے تماشا اس کا۔

مسٹر فش سے یہ معلومات حاصل کر کے اب میں سمجھا کہ پورب پچھّم کے سرے ملنے کا کیا راز ہے اور ایک مرد عورت سے کیا چاہتا ہے۔ اگر یہ راز ادنیٰ ترین عورت بھی جان لے تو اعلیٰ ترین مرد کو غلام بنا سکتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ میرا خیال صحیح ہے یا غلط؟

ہولناک جرم

ٹھیک اسی وقت ڈیوڑھی میں ''وہ'' کھنکھارے اور صحن میں آ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ سشیلا میرے کمرے سے نکلی۔ اداس اداس چہرے کے ساتھ۔ وہ کچھ ایسی اداس تھی کہ ''انھیں'' سلام کرنا بھی بھولی۔ چاہتی تھی کہ سمٹ کر نکل جائے لیکن ''انھوں'' نے تاڑ لیا۔ سمجھ گئے، کوئی بات ضرور ہے کہ آج پہلی بار سشیلا اس گھر سے اداس اداس چہرہ لے کر جا رہی ہے۔ سلام بھی نہیں کیا انھیں۔

''کیا بات ہے؟'' انھوں نے سشیلا سے پوچھا۔ وہ جواب دیے بغیر جھٹ سے نکل جانا چاہتی تھی۔

''پگلی! تو نے مجھے سلام بھی نہیں کیا؟'' انھوں نے اسے روکا۔ وہ دیوار سے لگ کر سمٹی اور چاہا کہ بھاگ جائے۔

''کیا پٹے گی؟'' انھوں نے اسے پکڑ لیا۔ ''یہ تیری آنکھوں میں آنسو کیسے؟''

''چھوڑیئے بھیا جی!'' اور یہ کہنے کے ساتھ آنسوؤں کے دو بڑے بڑے موتی اس کی موتی جھیل سے نکل کر ''ان'' کی آستین پر گرے اور جذب ہو گئے۔ وہ آستین کو دیکھنے لگے۔ سمجھ گئے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

''تو یہاں سے یہ چہرہ لے کر نہیں جائے گی۔ میں رمیش چاچا کو کیا منھ دکھاؤں گا۔''

وہ چپ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اب اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

''اچھا، میں سمجھا اپنی بھابی سے لڑی ہے شاید۔'' وہ روتی رہی۔ کچھ نہ بولی۔

''بتاتی کیوں نہیں۔'' انھوں نے ڈانٹا۔ پیار کی ڈانٹ پڑی تو وہ بچوں کی طرح ہمک ہمک کر رونے لگی۔

''کیا مصیبت ہے، کچھ بتاتی بھی نہیں۔ اچھا آ۔'' وہ اسے کھینچ کر میرے کمرے کے دروازے پر لے آئے۔

''تم نے اسے کچھ کہا ہے؟'' انھوں نے میری طرف دیکھا۔

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ مجھ سے قرآن شریف مانگنے آئی تھی۔ میں نے نہیں دیا۔ بس ناراض ہوگئی۔ جیسی دبلی پتلی نازک ہے ویسی ہی نازک مزاج بھی ہے۔''

''اور تم نے مجھے گالی نہیں دی؟'' سشیلا نے تیز ہو کر کہا۔

''سن رہے ہو۔ ہمیشہ مجھے، آپ، کہتی تھی، آج ''تم'' کہہ رہی ہے۔ کس قدر بدتمیز ہے۔ تم نے اسے سر چڑھا رکھا ہے جو اسی کا نتیجہ ہے۔''

کیا گالی دی انھوں نے۔ یہ تو تجھے پیار کرتی تھیں!'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

''مجھے مشرک، کافر، ناپاک، نجس اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔''

''سوچنے کی بات ہے'' میں بیچ میں بول اٹھی۔ میں قرآن پاک اسے کیسے دیتی۔ ہم مسلمان بے وضو ہوتے ہیں تو نہیں چھوتے، اسے کیسے تھما دیتی۔ یہ تو.........

''ہاں ہاں! پھر کہہ ڈالیے.........اس بھولی اور معصوم بچی کو مشرک کافر، ناپاک، نجس، شرم نہیں آتی۔ یہ گالی نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا کوئی غنڈہ ماں بہن کی گالی دے تو گالی ہوگی۔ آخر آپ نے اسے کافر اور مشرک کیوں کہہ دیا۔ معصوم بچی ہے اسے ناپاک اور نجس کیوں کہا؟

''ہٹو بھی! چلے وہاں سے بہن کی طرف داری کرنے۔ قرآن کا ادب واحترام بھی تو کوئی چیز ہے۔'' میں جھنجھلا گئی۔

''اچھا بس کیجیے گا۔ میں جانتا ہوں قرآن کا ادب واحترام کتنا کرتی ہو، بس اسے چوم لو، چاٹ لو، آنکھوں سے لگالو، روز ایک آدھ پارہ پڑھ لو، لو بس ہوگیا احترام۔ آبیٹی میں تجھے اپنا قرآن دوں۔ آسان ترجمہ والا۔''

اور یہ کہہ کر وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔ اپنا قرآن اسے دے دیا۔ وہ قرآن پا کر خوش ہوگئی۔ پھر جوان کے ساتھ میرے کمرے کی طرف سے باہر جانے لگی تو اس طرح مجھ پر

نظر ڈالی جیسے کوئی سپہ سالار کوئی سیناپتی ہو، جس نے بہت بڑی لڑائی جیتی ہو، بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اور داہنے ہاتھ سے قرآن دکھاتی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے۔ کپڑے بھی نہیں اتارے۔ جوتے اتار کر چپل بھی نہیں مانگے، چائے پانی کی فرمائش بھی نہیں کی۔ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ دو منٹ خاموش بیٹھے رہے اس کے بعد بولے:

"تم نے اپنے لیے اچھا نہیں کیا۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ اسے جھڑک دیا۔ اسے ایسے سخت لفظ کہہ ڈالے۔"

"تو کیا غلط کہا میں نے؟"

"بالکل غلط کہا۔"

"تو کیا قرآن کو نجس آدمی چھو سکتا ہے؟"

"نہیں؟"

"تو پھر!"

"تو پھر سوچ لیجیے، اول تو سشیلا ابھی بچی ہے۔ نہ جانے کس شوق میں قرآن لینے آئی۔ ممکن ہے رمیش چاچا نے منگوایا ہو۔ پھر یہ کہ قرآن جز دان کے اندر ہے۔ مولوی عالم اور فقہ جاننے والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ جز دان میں قرآن ہو تو ہم۔ "ہم" کے معنی سمجھیں آپ؟ ہم مسلمان چھو سکتے ہیں۔ یہ ادب و احترام ہمارے لیے ہے۔ جو قرآن کو کلام الٰہی مانتے ہیں لیکن وہ بے چارے جو اسے کلام الٰہی سنتے ہیں مگر مانتے نہیں تو وہ کیوں وہ احترام کریں جو ہم کرتے ہیں۔"

"اسی لیے تو میں نے نہیں دیا تھا۔"

"لیکن اگر کوئی غیر مسلم اس کا مطالعہ کرنا چاہے تو؟"

"تو یہ...... تو یہ کہ ......" میں ہکلا گئی۔ "وہ اسے کیسے چھو سکتا ہے، وہ تو ہے ہی مشرک۔ قرآن کہتا ہے کہ مشرک نجس ہوتا ہے۔"

"خوب سمجھا آپ نے قرآن۔ اچھا یہ بتایئے ملانی جی! جب پہلے پہل قرآن نازل ہوا تھا تو دنیا میں کتنے مسلمان تھے؟"

''ایک بھی نہیں۔''

''تو کیا خیال ہے آپ کا۔ یہ قرآن صرف مسلمانوں کا ہے۔ یہی اس کے اجارہ دار ہیں۔ غیر مسلموں کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے بندے ہم تم ہیں، یہ نہیں؟''

''تو وہ مسلمان ہو جائیں تو پڑھیں۔'' یہ میں نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر مجھے ایسا لگا جیسے میں نے بہت ہلکی بات کہی ہو۔

''اگر اسلام سمجھنے کے لیے پڑھنا چاہیں تو؟''

''تو .... تو یہ کہ ...... اچھا پہلے آپ یہ جو کپڑوں میں قید ہیں، اس سے نجات حاصل کر لیں۔ پھر بات ....''

''جی نہیں! میرے خیال میں تم نے ایک غریب کا دل دکھایا۔ تم کو اس سے معافی مانگنا ہوگی۔ سشیلا بہت اچھی بچی ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی بچہ نہیں۔ وہ کیسا کیسا ہمارے گھر آ کر کوئل کی طرح کوکتی ہے۔ ہم سب سے کس درجہ محبت کرتی ہے۔ رمیش چاچا بھی ہم سے محبت کرتے ہیں۔ بملا چاچی جی ہر دوسرے تیسرے دن آتی ہیں، کیسی اچھی گھریلو باتیں بتاتی اور سمجھاتی ہیں۔ ان کے یہ احسانات ہیں۔ خدا کرے سشیلا چاچا جی یا چاچی سے کچھ نہ کہے، اچھا میں ذرا ان سے مل آؤں۔''

وہ اٹھنا چاہتے تھے۔ میں نے روکا، اچھا، ذرا سستا تو لو۔ دفتر میں سر مار کر آئے ہو، اب وہاں جا کر دماغ پچی کرو۔

''یہ تو بتاؤ، بات تمہاری سمجھ میں آ گئی یا نہیں؟ میری پریشانی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تم سے یہ پوچھا کہ قرآن کی تعلیم پھیلانے میں تمہارا کیا رول رہا، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میدان محشر میں کچھ جواب نہ دے سکو۔ اور اس کی سزا بھگتو ....!''

یہ کہہ کر وہ جوتے کی ڈوری کھولنے لگے۔ میں نے دیکھا تو آنسوؤں کے بڑے بڑے دو قطرے ان کے جوتوں پر گرے۔

''اونھ! تم نے بھی ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیا۔''

''یہ ذرا سی بات نہیں ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جب تمہارا اور سشیلا کا معاملہ اللہ کے سامنے پیش ہوگا تو اگر جرح شروع ہو گئی تو تم تباہ ہو جاؤ گی۔''

ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ یہ دیکھ کر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اٹھ

کر باورچی خانے چلی گئی، اور چائے بنانے لگی۔

وہ گم صم بیٹھے رہے اور سوچتے رہے۔ میں نے دو بسکٹ لیے اور چائے لے جا کر پیش کی۔ بسکٹوں کی طرف انھوں نے دیکھا بھی نہیں۔ چائے کا ایک گھونٹ لیا اور پیالی رکھ دی۔

''تو کیا ہوگا وہاں؟'' ان کی زبان سے آپ سے آپ نکل گیا۔

''کہاں؟''

''میدان محشر میں۔'' انھوں نے جواب دیا۔ محشر کا خلجان انھیں بے چین کیے جا رہا تھا۔

''اچھا میں سشیلا کو منا لوں گی۔'' میں نے ان کی بے چینی دیکھ کر کہا۔

''معافی نہ مانگو گی؟''

''معافی اللہ سے مانگ لوں گی۔''

''نہ، چلو چلیں رمیش چاچا کے یہاں۔''

''اب میں کھانا دانا کروں گی۔ ابھی میں نے عصر کی نماز بھی نہیں پڑھی ہے، کل کسی وقت چلوں گی۔''

انھوں نے بہت کہا، لیکن میں نے وقت کی تنگی کا بہانہ کر دیا۔ وہ افسوس کرتے ہوئے مسجد کو چلے گئے۔ میں نے عصر کی نماز پڑھی اور باورچی خانے میں گھس گئی۔ کھانا پکاتے وقت اچانک ایک لکڑی، خدا جانے وہ کس درخت کی تھی چیخ چیخ کر جلنے لگی۔ اور اس کی چنگاریاں ادھر ادھر اڑنے لگیں۔ میں نے سوچا اسے چولھے سے نکال کر پھینک دوں۔ اسی ارادے سے میں وہ لکڑی چولھے سے نکالی تو وہ پھر چٹخی۔ کئی چنگاریاں مجھ پر آ گریں۔ میں نے لکڑی پھینک دی اور اف اف کرنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اسی وقت مسجد سے آئے تھے۔

''چنگاریاں چہرے پر آ گئیں۔'' میں نے بتایا۔

''اللہ تعالیٰ تم کو جہنم کی چنگاریوں سے بچائے۔'' میں سمجھ گئی کہ ابھی تک ان پر میرے اس رویے کا اثر ہے جو ایک گھنٹہ پہلے ان کے سامنے آیا تھا۔

''آمین! بھی نہیں کہی تم نے۔''

''آمین!'' لو کہہ دیا، اب تو خوش ہو جاؤ۔ میرے سرتاج!''

ان کی عادت تھی کہ مغرب کے بعد کھانا کھا کر لائبریری جایا کرتے تھے آج وہاں بھی نہیں گئے، عشاء کی اذان سن کر مسجد گئے اور سیدھے گھر آ گئے۔ میں نے بستر کر دیا تھا۔ آ کر لیٹ گئے۔ دوسرے پلنگ پر میں لیٹ گئی۔ ہم ابھی سوئے نہیں تھے کہ انھوں نے وعظ شروع کر دیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے دعوت و تبلیغ کے طریقوں اور مسلمانوں کی ذمے داریوں پر کھل کر روشنی ڈالی۔ تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ ''اللہ کا دین اللہ کے بندوں تک پہنچانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اگر اس فرض کو ادا نہ کیا جائے گا تو آخرت میں پکڑ ہوگی۔ مسلمانوں میں تبلیغ کرتے وقت انھیں یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ لیکن غیر مسلموں کو اچھی طرح سمجھایا جائے، انھیں اسلامی تعلیمات کی کتابیں دی جائیں۔ خصوصاً ترجمہ والا قرآن۔''

تقریر کی تان قرآن پر ٹوٹی تو میں سمجھ گئی کہ میرے ''مولانا صاحب'' کا روئے سخن کس کی طرف ہے۔ میں نے کروٹ لے لی۔ اور سوتی بن گئی۔ ''مولانا'' کی تقریر ختم ہوگئی اور انھوں نے بھی ایک طرف کروٹ لے لی۔ چلو پیچھا چھٹا

مگر پیچھا کہاں چھوٹا۔ خیالات تو میرے دماغ میں وہی چھائے ہوئے تھے۔ سوتے سوتے بھی انہی خیالات میں کھوئی رہی۔ یہ تو احساس مجھے ہوگیا کہ میں نے غلطی کی۔ غیر مسلم لوگ اگر اسلام سے اب تک جانکاری حاصل نہ کر سکے تو اس میں ہمارا ہی قصور ہے۔ اور یہ تو واقعی میں نے غلطی کی کہ سشیلا کو قرآن نہیں دیا۔

میں سوگئی۔ اچانک میرے کانوں میں آواز آئی۔ ''سشیلا کوئی حاضر ہے۔'' میں چونک پڑی۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو میدان محشر کا نقشہ میرے سامنے تھا۔ صاحب ذوالجلال اپنے عرش پر جلوہ فرما تھا۔ فرشتے صف بہ صف عرش کے آس پاس کھڑے تھے۔ میزان نصب تھی۔ لوگوں کی نیکیاں اور برائیاں تولی جا رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کو فرشتے مبارک باد دیتے ہوئے جنت کی طرف لیے جا رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو غضب ناک فرشتے جہنم کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ جنت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ داہنی طرف تھی۔ جہنم اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ بائیں طرف۔ ''ہل من مزید'' کی آواز اس سے بار بار آ رہی تھی۔ اور لوگوں کا یہ حال کہ کسی کو ہوش نہ تھا۔ نفسی نفسی پڑی تھی۔ دوزخ پر میری نظر پڑی تو میں گھبرا گئی۔ دل میں کہا۔ ''اے کاش کہ میں اس سے بچ جاؤں، اور چاہے ساری دنیا اس میں جھونک دی جائے۔''

میں نے دیکھا، کرامت میاں کو فرشتے زنجیروں میں جکڑے ہوئے گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ زندگی بھر ریا کاری سے کام لیا۔ یہ لمبی ڈاڑھی، یہ لمبا کرتا، یہ گیروا رنگ، ہزار دانہ تسبیح، ہر وقت ہو حق میں مست، لیکن ایک دن جب بدلوا اپنی بدلیا کو لے کر آیا اور میاں سے کہا "ہمیں مسلمان کر لیجیے۔" تو انھوں نے اس ڈر سے کہ کہیں ڈپٹی صاحب کو معلوم ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ بدلوا کو جھڑک دیا تھا۔

"سشیلا کوئی حاضر ہے!" آواز پھر میرے کانوں میں آئی۔ میں نے دیکھا سشیلا ایک طرف کو دوڑتی، لرزتی آگے بڑھی۔ فرشتے پہلے اسے میزان کے پاس لے گئے۔ اس کا مقدمہ پیش ہوتے دیکھ کر آپ سے آپ میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ میں نے دیکھا فرشتوں نے سشیلا کے ہاتھ سے ایک کاغذ لیا، اور میزان کے داہنے پلڑے میں رکھ دیا۔ پلڑا جھٹ سے جھک گیا۔ بائیں پلڑے میں کچھ تھا۔ فرشتوں نے عرش کی طرف دیکھا۔

"اے رب ذوالجلال والاکرام! یہ معصوم لڑکی ہے، بائیں پلڑے میں رکھنے کے لیے اس کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں لکھا گیا۔"

"اسے ہمارے حضور لاؤ۔" ایک بزرگ فرشتے نے سشیلا کا ہاتھ پکڑ کر عرش کے سامنے کر دیا۔ سشیلا ہکا بکا تھی، آنکھیں پھاڑے کبھی فرشتوں کو اور کبھی عرش کو دیکھ رہی تھی۔ اسی بزرگ فرشتے نے اس سے جرح شروع کی۔

"تیرا دین؟"

میں نے دیکھا، سشیلا گھبرا گئی۔ وہ بولی:

"میرا دین۔ میرا دین......." وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"جلدی بتا تیرا دین کیا رہا۔"

"بابو جی!" وہ رونے لگی۔

"بابو جی کیا۔" یہاں باپ دادا کوئی کام نہ آئیں گے۔ جلدی بتا، تیرا دین کیا رہا۔

وہ بڑی الجھن میں تھی، اس نے کہا:

"قرآن!"

"بے وقوف لڑکی! قرآن تو اللہ کے کلام کی کتاب کا نام ہے۔ قرآن نے تجھے کون

سا دین دیا ہے؟''

''مجھ کو قرآن کل ملا، ابھی میں نے پڑھا نہیں۔''

''برباد ہو گئی تو!''

''خبردار! اے میرے مقرب فرشتے! میری بندی کو گھبراؤ مت۔ میں اس سے خود پوچھوں گا۔''

وہ بزرگ فرشتہ استغفار پڑھتا ہوا سجدے میں گر گیا۔

''میری بندی!'' ایک ایسی آواز میں نے سنی، جس میں وہ پیار تھا جو نہ دیکھا نہ سنا۔

''میرے مالک! میرے سوامی!''

''اب تو تو بڑی ہو گئی نا!'' اس آواز کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ شفقت و رحمت سے بھرپور نور میں سشیلا نہا گئی۔ اس نے کہا:

''میرے مالک! میرے سوامی!''

''تو نے اب تک قرآن پڑھا کیوں نہیں۔ میرے دین کو جانا کیوں نہیں؟''

سشیلا پھر گھبرانے لگی۔

''میری بندی! پریشان نہ ہو۔ میرے سامنے میرے بندے گھبراتے نہیں۔ بتا کیا بات ہے؟'' جیسے سشیلا کو بڑا سہارا مل گیا۔ وہ بولی:

''میں نے شکیلہ بھابی سے دین سمجھنا چاہا۔ ان سے قرآن مانگا تو انہوں نے مجھے کافر، مشرک، نجس، ناپاک کہہ کر جھڑک دیا۔ میں نے سنا تھا، میرے بابو جی نے بتایا تھا کہ خدا ایک ہے کا مطلب سمجھنا ہو تو قرآن دیکھو اسی لیے میں گئی تھی۔ بھابی نے مجھے نہیں دیا۔''

کڑ کڑ، تڑ تڑ، کڑ کڑاک۔ ایسی کڑی آواز یکدم آئی جیسے لاکھوں بجلیاں آپس میں ٹکرا گئی ہوں۔ میدان محشر اس کڑاکے سے ہل گیا۔ جہنم نے پکارا۔ ''ہل من مزید۔''

اس کے بعد آناً فاناً پھر سکوت طاری ہو گیا۔ اب جو آواز میں نے سنی اس کے سننے کے لیے میں ہرگز تیار نہ تھی۔

''شکیلہ خاتون، کوئی حاضر ہے!'' اور جیسے کسی نے پیچھے سے مجھے دھکا دیا اور عرش کی طرف لے چلا۔ میں عدالت کی طرف جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر جا رہی تھی۔ کسی نے پکڑ کر مجھے

سشیلا کے برابر کھڑا کر دیا۔ اب مجھ سے جرح ہونے لگی۔

"تمہارا دین؟"

"اسلام۔"

"تمہارا رسول؟"

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔"

"تمہاری کتاب؟"

"قرآن پاک۔"

"میں نے خوش تھی کہ جواب ٹھیک دیے جا رہی تھی۔ پھر مجھ سے پوچھا گیا۔

"تم نے قرآن کتنے بندوں تک پہنچایا؟"

"مولا! میں نماز پڑھتی تھی، روزہ رکھتی تھی، اجتماعات میں جاتی تھی، میں تقریر کرتی تھی اور قرآن کی تعلیمات اپنی تقریروں میں پیش کرتی تھی۔ سیکڑوں عورتوں نے میری تقریر سنی ہے۔"

"یہ سشیلا کہتی ہے کہ تم نے اسے قرآن سے محروم رکھا۔"

اس کے جواب میں میں کچھ کہنا چاہتی کہ میری زبان پھول کر منھ میں بھر گئی۔ میں کچھ بول نہ سکی۔

"کیا قرآن صرف مسلمان کے لیے تھا؟"

"میں نے چاہا کہ ہاتھ سے یا کسی اور اشارے سے جواب دوں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان سب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

"تم نے سشیلا کو کافر اور مشرک کیوں کہا۔ جب کہ تم نے اس کے سامنے دین پیش نہیں کیا۔ تم دین پیش کرتیں، اسے سمجھاتیں، پھر اگر یہ انکار کرتی اور تمہاری راہ روکتی تب تم کو حق تھا جو کچھ کہتیں، مگر تم نے اس پر ظلم کیا ہے۔ فرشتو! لے جاؤ اس ظالم کو، جہنم میں جھونک دو۔ اور اس سشیلا کو ہماری رحمت کی جگہ میں وہاں پہنچا دو جو معصوم بچوں کے لیے ہے۔"

فیصلہ ہوتے ہی غضب ناک فرشتے میری طرف بڑھے۔ آگ سے سرخ کی ہوئی ایک زنجیر انھوں نے مجھ پر پھینکی۔ لال لال زنجیروں کے شعلوں ہی سے میرا جسم جھلس گیا۔ میں نے چیخنا چاہا۔ لیکن مجھ سے بولا نہ گیا۔ منھ میں زبان پھولی ہوئی تھی، میں نے بولنے کی کوشش کی۔

گھوگھی گھی میری زبان سے بمشکل نکلا۔

''ارے! کیا ہے، شکیلہ! شکیلہ! کیا خواب دیکھا۔''

مجھے کسی نے جھنجھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا، میرا پیارا شوہر مجھے جگا رہا تھا۔ میرا رواں رواں لرز رہا تھا۔

''مجھے سشیلا کے پاس لے چلو۔''

''آدھی رات کا وقت ہے اس وقت؟''

''جی، اسی وقت مجھے سشیلا کے پاس لے چلو۔''

''ارے بھئی بات تو بتاؤ۔ یہ اچانک تم کو کیا ہو گیا؟''

میں نے خواب بیان کیا، بولے:

''یہی وہ دن تھا جس سے میں نے تمہیں ڈرایا تھا۔ خیر اب سو جاؤ، صبح چلیں گے۔

اور میں صبح کے انتظار میں پھر نہ سو سکی۔

نبیوں کی ماں

اس کے شوہر کو قوم نے کسی طرح برداشت نہیں کیا۔ باپ ملک کے فرماں روا کی طرف سے سب سے بڑا مذہبی پیشوا اور سرکاری پروہت تھا۔ اس کے گھر دولت کی ریل پیل تھی۔ دولت مند باپ نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ بہو چاہتی تو شوہر کو چھوڑ کر خسر کے زیر سایہ شاہانہ زندگی بسر کر سکتی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو شوہر سے ناتہ توڑ کر ''مادر وطن'' کی آنکھ کا تارا ہی رہتی ،لیکن اب معاملہ محض شوہر پرستی کا نہ تھا بلکہ شوہر اب اللہ کا رسولؑ بن چکا تھا اور اب سوال یہ تھا کہ اللہ کو کیسے راضی کیا جائے۔ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس نے عیش و آرام کو لات ماری، دولت ،عزت، خاندان، وطن سب کچھ ٹھکرا دیا، محض خدا کی خوشنودی کے لیے، جس وقت اس نے دل میں طے کیا اس وقت اس کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل نہ تھی، کہ گھر سے نکلنے کے بعد بیابانوں کی خاک چھاننا ہوگی۔ کانٹوں کا سامنا ہوگا۔ خوف ناک درندوں سے سابقہ پڑے گا۔ دنیا اس آواز سے آشنا نہیں ہے جو اس کا شوہر بلند کر رہا ہے۔ عراق کی وہ مشہور ندیاں اس کے سامنے تھیں، جن کو محض اللہ کے بھروسے پر ہی عبور کیا جا سکتا ہے۔ وسط ایشیا کا وہ بلند و بالا اور نا قابل تسخیر سلسلہ کوہ اس کی نظروں میں تھا جسے پار کرنا اس وقت ایک عجوبے سے کم نہ تھا اور پھر عرب کا وہ تپتا ہوا ریگستان جو بڑے بڑوں کا پتا پانی کر دیتا ہے۔ عرب کے وہ گرم پہاڑ جن کی طرف دن میں دیکھنے سے آنکھوں کی پتلیاں جل اٹھتی ہیں۔ یہ سب بھی اس نے سن رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ برہنہ پا ہی ان سب کو عبور کرنا ہوگا۔ پھر بھی وہ ذرا نہ جھجکی۔ اس کو کوئی خوف ہجرت سے باز نہ رکھ سکا۔ عیش، لالچ، دباؤ اور غریب الوطنی کا ڈر، ان سب میں سے کوئی قوت اسے قدم آگے بڑھانے سے نہ روک سکی۔ اور وہ اللہ کا نام لے کر اپنے مہاجر شوہر کے پیچھے ہولی۔ قوم کے مرد اس کے اس

اقدام سے کانپ اٹھے۔ علاقہ ''ار'' کی بسنے والیاں تھرا کر رہ گئیں۔ باپ نے بڑھ کر روکا۔ ماں نے سمجھایا۔ رشتے داروں نے نشیب و فراز سے آگاہ کیا لیکن وہ نہ مانی۔ اس نے حق کی جس آواز پر لبیک کہا تھا۔ اسی کے کارن اس نے وہ راہ اختیار کی جس کی صعوبتیں تقریباً پانچ ہزار برس بعد آج کی دنیا سمجھ ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس اللہ کی بندی، بنی نوع انسان کی نرم و نزاکت صنف نے اسی راہ پر قدم رکھ دیا اور وہ اللہ کا نام لے کر اپنے مہاجر شوہر کے پیچھے ہولی۔ اس نے ہزاروں میل پیدل چل کر اپنے شوہر کے ساتھ دنیا کے بسنے والوں کو حق کی دعوت دی۔ پہاڑوں کی کھوہوں میں بسنے والے خاندان کو پکارا، ریگستان کے خانہ بدوش قبیلوں کو آواز دی اور اس شوہر کی آواز میں آواز ملا کر جسے اللہ نے اپنا رسولؑ بنایا تھا۔ بار بار کہا:

''لوگو! اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں ہوسکتا، جس نے تمہیں پیدا کیا اور جس نے تمہارے لیے یہ دنیا سنوار دی، تم اس کو چھوڑ کر کدھر بہکے جا رہے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔''

جنگلوں کے کانٹوں نے اس کے نازک تلوؤں کو چھلنی کر دیا۔ ریگستان کی تپتی ہوئی ریت نے اس کی پاؤں میں چھالے ڈال دیے اور شعلوں کی طرح گرم ہواؤں نے اس کے جسم کو جھلس دیا۔ لیکن وہ جنگل کے باسیوں، ریگستان کے بدوؤں اور ساحلی علاقوں کے باشندوں کو ایک خدا کی طرف بلانے سے نہ تھکی۔

وہ بھی کیسا نازک موقع تھا، جب اس کا داخلہ مصر میں ہوا۔ اور مصر کے بادشاہ نے اس کے حسن و جمال کا شہرہ سن کر پکڑ بلایا۔ اور پھر اس عفت مآب یعنی اللہ کے مہاجر رسولؑ کی بیوی پر ہاتھ ڈال دیا۔ ایک باعصمت خاتون ہی سمجھ سکتی ہے کہ اس وقت اس غریب نے دل کی کس گہرائی سے خدا کو پکارا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس کی زبان سے صرف ''یا اللہ'' ہی نکلا تھا کہ بادشاہ کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا۔ اور اس نے اس پاکیزہ خاتون کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے تین بار تجربہ کیا، اور ہر بار اس کا یہی حشر ہوا اور ہر بار اس کے گڑگڑانے پر اس بھولی خاتون نے اسے معاف کر دیا۔ پھر کیا ہوا؟ پھر حق کا اثر اس فرماں روا پر ہوا اور اس نے مرعوب ہو کر اپنے محل کی سب سے زیادہ نیک اور ذہین لڑکی (شاید بیٹی یا بھتیجی) کو اس کی تربیت میں دے دیا۔ اور کہہ دیا: ''اختیار ہے، چاہے تو اس شہزادی کو لونڈی بنا لے۔'' مگر اس شریف خاتون نے کیا کیا؟ اس نے بڑی فراخ دلی سے اسے اپنے شوہر کے نکاح میں دے دیا۔

اس طرح راضی برضا ہو کر اس پر قائم رہنا آسان کام نہیں۔ یہ وہ معمولی کام نہیں جس کی داد سطح بیں شخص دے سکے۔

حق کی تبلیغ کرتے ہوئے اللہ کے ایک عظیم رسول کی تقلید میں دین کی دعوت پیش کرتے کرتے وہ بوڑھی ہوگئی۔ آخر اللہ نے بھی اس کو وہ مرتبہ عطا فرمایا جو پھر کوئی عورت نہ پاسکی۔ پروردگار کون ومکاں نے اس کے بطن مبارک سے وہ پیغمبری سلسلۂ نسب شروع کیا، جس کی ابتدا حضرت اسحاق علیہ السلام سے ہوئی اور انتہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر۔

سلام ہو اس صنف نازک کے اس عہد واثق پر، سلام ہو اس عورت پر جس نے ایک بار شعور کے ساتھ حق کو اختیار کیا اور ساری عمر اس پر جمی رہی۔ بے پایاں سلام ہو نبیوں کی اس محترم ماں حضرت سارہؓ پر جنھوں نے وہ نمونہ پیش کیا جو قیامت تک صنف نازک کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس کے بعد سلام ہو ان پاکیزہ خواتین پر جو اسی کے اسوہ کو اپنے لیے مشعل ہدایت بنائیں اور اپنے دین دار شوہر کے قدم بقدم اسلام کو سربلند کرنے میں اپنی جان کی پروا نہ کریں۔

؟

''اے بھائی یہ مقام جعرانہ ہے نا؟''

''ہاں اے محترم خاتون یہ جعرانہ ہی ہے۔ وہ کیا غرض ہے جو آپ کو یہاں کھینچ لائی ہے؟''

''اے سنجیدہ انسان مجھے توقع ہے کہ تو مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دے گا، میں یہاں اپنے بیٹے سے ملنے آئی ہوں؟''

''آپ کے بیٹے کا کیا نام ہے؟''

''میرے بیٹے کا نام محمدؐ ہے۔''

''محمدؐ! آپ کے بیٹے کا نام محمدؐ ہے؟ اس نام کے تو کئی شخص یہاں ہیں۔''

''میں محمد بن عبداللہ سے ملنے آئی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ میرے بیٹے پر اللہ نے اپنی سب سے بڑی رحمت نازل فرمائی ہے۔''

''یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔'' بے شک اے محترم خاتون! ان پر اللہ نے سب سے بڑی نعمت نازل فرمائی ہے، مگر ان کی والدہ محترمہ کا انتقال تو ان کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ معاف فرمایئے گا۔ آپ اس عمر میں داخل ہو چکی ہیں جس میں انسان کا دماغ اس کے بس میں نہیں رہتا۔''

''اے سنجیدہ انسان تو نے بھی وہی بات کہی جو کئی اور آدمیوں سے اپنے متعلق سن چکی ہوں۔ لوگوں سے جب میں نے اپنے بیٹے محمد بن عبداللہ کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا دیے، پھر مجھ سے تو نہیں، آپس میں کہنے لگے کہ اس بڑھیا پر جنون کا اثر معلوم ہوتا ہے، حالانکہ واللہ میں سچ کہتی ہوں، کیا تم مجھے محمد بن عبداللہ کے پاس لے چلو گے؟''

''میرے ساتھ آیئے۔''

''مرحبا! اللہ تیرے چہرے کو روشن کرے۔''

اس مختصر سی گفتگو کے بعد معمر خاتون اس سنجیدہ شخص کے ساتھ ہولی۔ وہ زیرلب کہتی جاتی تھی لوگ مجھے مجنون سمجھ رہے ہیں۔لیکن جب میں اپنے بیٹے سے ملوں گی تو سب حیران رہ جائیں گے، میرا بیٹا مجھے ضرور پہچان لے گا۔ شیما کہتی تھی'' ماں! آپ کا بیٹا محمدؐ آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔'' ہاں وہ ضرور یاد کرتا ہوگا۔

''محترمہ! آپ زیرلب کیا فرما رہی ہیں۔ کچھ الفاظ میں سن رہا ہوں لیکن مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تم میرے بیٹے کے پاس لے چلو، سب سمجھ جاؤ گے۔''

''وہ دیکھو سامنے لوگ بیٹھے ہیں اور وہ ہیں محمد بن عبداللہ۔ اللہ کے آخری رسولؐ، ان پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔''

یہ سن کر معمر خاتون سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس نے ایک نظر مجمع پر ڈالی پھر اچانک اس پر والہانہ کیفیت طاری ہوگئی۔

''یہی ہے میرا بیٹا محمدؐ! خدا کی قسم میں نے پہچان لیا۔ نہ میری آنکھوں نے مجھے دھوکا دیا اور نہ میرے ذہن نے۔''

وہ والہانہ انداز میں بڑھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ کے اسی مقام پر اپنے ساتھیوں میں گوشت تقسیم فرما رہے تھے۔ (ان سب پر اللہ کی رحمت ہو) آپ نے دفعتاً اس معمر خاتون کو دیکھا۔ ''میری ماں!'' کہتے ہوئے آگے بڑھے، معمر خاتون، ''میرا بیٹا، میرا بیٹا!'' کہتی ہوئی اس طرح چلی جا رہی تھی جیسے کوئی غیبی کشش آپ سے اسے اس طرف کھینچ رہی ہو۔ اس کے پاؤں اس کی عجلت کا ساتھ نہ دے سکے، وہ زمین پر بیٹھ گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھتے ہی تمام صحابہؓ کی نظروں نے حیرت واستعجاب کے ساتھ اس منظر کو دیکھا جو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سب دم بخود سوچ رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ پھر یہ کون خاتون ہیں جن کی طرف حضورؐ بے تاب ہو کر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ سمجھ کوئی نہ سکا۔ لیکن سب نے آگے بڑھ کر اس معمر خاتون پر سایہ کر لیا۔ اللہ کے رسولؐ نے اپنی چادر دی، اس پر میری ماں کو بٹھا دو۔ لوگوں کو اور زیادہ حیرت ہوئی کہ یہ

شرف اس خاتون کے سوا کسی کو نصیب نہ ہوا۔

''شیما نے تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو سلام کہا ہے۔''

''ان پر بھی سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت اور آپ پر بھی۔'' صحابہؓ کے مجمع میں ایک گونج پیدا ہوئی، معمر خاتون نے ایک نظر سب پر ڈالی اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

''شیما'' یہ بھی کہتی تھی کہ تجھ پر اللہ نے سب سے بڑی رحمت اور نعمت اتاری لیکن میں دیکھتی ہوں کہ تو بے حد دبلا ہو رہا ہے۔''

''ماں مجھے اللہ نے اپنا رسولؐ بنایا ہے۔ میں نبوت کے بوجھ سے دبا جا رہا ہوں، کیا آپ میری نبوت کی تصدیق فرمائیں گی۔''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں، میں گواہی دیتی ہوں کہ محمد بن عبداللہؐ اللہ کا رسول ہے۔ اے میرے بیٹے! ایسی فیاضی ایک نبی اور اس کے ساتھی ہی کر سکتے ہیں۔ ہوازن کی لڑائی میں جب شیما اور اس کے ساتھی اور سینکڑوں بنو سعد قید ہو کر آئے تو محض میرے دودھ کی بدولت فدیہ لیے بغیر انھیں آزاد کر دیا گیا۔ اے میرے بیٹے تو بھی شریف ہے اور تیرے ساتھی بھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کی اس وقت انتہا نہ تھی۔ لیکن یہ معمہ ہنوز معمہ ہی تھا کہ یہ خاتون حضورؐ کی ماں کیسے ہو سکتی ہے۔ جب کہ آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال آپؐ کے بچپن ہی میں ہو چکا ہے۔

شیما، یہ بھی کہتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نبوت کا بوجھ جس بندے پر ڈالا اس کے جسم پر گوشت نہ چڑھ سکا۔ سچ کہا تھا۔ شیما نے۔

''میں نے پالیا، میں نے پالیا۔'' اچانک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے نکلا، سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔ حضرت صدیقؓ کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا سب کو اعتراف تھا ہی، پوچھنے لگے کون ہے یہ بزرگ خاتون۔ جناب ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ سے نہایت ادب سے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ اب صبر نہیں ہوتا، واللہ یہ حلیمہ سعدیہ ہیں۔

حضورؐ نے صدیق اکبرؓ کی بات سنی۔ ان کی طرف دیکھا۔ فرمایا بے شک یہ حلیمہ سعدیہ ہیں۔ قبیلہ ہوازن کی سب سے زیادہ معزز خاتون۔ انھوں نے مجھے چار برس پالا، اللہ ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔ یہ میری ماں ہیں۔ اور اب مسلمان ہو چکی ہیں۔ رضی اللہ عنہا

مسز ڈاکٹر وحشی

ممانی صاحبہ یکدم اداس ہو گئیں۔ ایک لمبی سانس بھر کر دوپٹہ سر پر رکھ لیا۔ میں ان کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی۔ پھر عرض کیا کہ ممانی جان چائے بناؤں اور پھر ان کے کچھ کہے بغیر ہیٹر پر پانی گرم کرنے لگی۔ چائے بنا کر پیش کی۔ چائے پی کر کہنے لگیں۔

ممانی صاحبہ: ہاں۔ شاید میری زندگی سے نوجوان لڑکیوں کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ اچھا تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟

میں: میں آج تک یہ نہ سمجھ سکی کہ ماموں جان کی نازک مزاجی کو آپ نے کیسے معتدل کیا۔

ممانی صاحبہ: معتدل؟ کیا مطلب؟

میں: میں ذرا جھجک رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے عرض کروں۔ ادب مانع ہے۔ میرا مطلب ہے کہ مرحوم کیسے حسین وجمیل اور اپنے پیشے میں کامیاب شخص تھے، انھوں نے کئی شادیاں کیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ اندر سبھا کی پری ان کے نکاح میں آئی۔ تعلیم میں بھی کم نہیں تھی کوئی۔ پھر بھی ماموں نے (اللہ بخشے) ان کو طلاق دے دی۔ لیکن آپ .... یہ کیا کہتے ہیں کہ یعنی آپ........!

میری زبان لڑکھڑا گئی۔ اور میں گھبرا گئی کہ کیا کہوں۔ ممانی صاحبہ نے میری مشکل سمجھ لی اور بولیں:

ممانی صاحبہ: میں سمجھ گئی تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ یہی نا کہ میرا رنگ سانولا ہے اور تعلیمی استعداد میں اس درجے کی نہیں، جیسی ڈاکٹر مرحوم کی دوسری بیویاں تھیں پھر بھی مرحوم (اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں رکھے) مجھ سے خوش رہے۔ خوش ہی نہیں، مجھ پر پورا بھروسہ کیا۔ بھروسہ ہی

نہیں، میری خواہشوں کا احترام کرتے رہے۔ تم یہی تو دریافت کرنا چاہتی ہونا کہ وہ کس طرح ایسے ہو گئے۔

میں: جی، میرا یہی مطلب ہے۔

ممانی صاحبہ: اچھا تو سنو، تمہارے ماموں دراصل ''بیوی'' تلاش کر رہے تھے۔ جب بیوی ان کو مل گئی تو مطمئن ہو گئے۔

میں: ممانی جان، وہ ان کی بیوی نہ تھیں تو اور کیا تھیں۔ اللہ اور رسولؐ کے ناموں کے حوالے سے پہلے خالہ زاد بہن کو قبولا۔ لیکن سال بھر بھی نہ نباہا، اپنی والدہ کی سگی بہن کا پاس اور لحاظ تک نہ کیا۔ سال بھی پورا نہ ہوا اور نکال باہر کیا۔

پھر سول سارجن کی لڑکی لائے۔ یہ دوسری بیوی ان کے پیشے میں بھی مدد کرتی تھی۔ اس بے چاری کو بھی سال بھر کے اندر دفعان کیا۔ اور........''

ممانی صاحبہ: رشو! سب سے پہلے یہ بات نوٹ کرلو۔ جب بات کرو تو اچھے الفاظ استعمال کرو، تمہارے ماموں بڑے ہی شستہ زبان تھے۔ جچے تلے الفاظ ان کے منہ سے نکلتے تھے۔ یہ قبولا، نباہا، دفعان سفان جیسے بازاری لفظ وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی خالہ زاد بہن میں ساری خوبیاں تھیں، لیکن شروع شروع میں کچھ ڈاکٹر مرحوم کی جلد بازی اور کچھ بیوی کی تمہاری جیسی الھڑ پنے کی باتوں سے بگاڑ پیدا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب ذرا صبر سے کام لیتے تو سال دو سال میں یہ باتیں آپ سے آپ ختم ہو جاتیں۔ لیکن جیسا کہ آج کل تمام نوجوان شوہر یہ چاہتے ہیں کہ انھیں بنی بنائی ''بیوی'' مل جائے۔ خود انھیں اپنی بیوی کو تربیت دینا نہ پڑے۔ ایسے ہی وہ تھے۔ انھوں نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ بیوی ہونے سے پہلے ہر عورت عورت ہی نہیں ایک ناتجربہ کار لڑکی ہوتی ہے۔ مرد پہلے اسے اپنے عقد میں لیتا ہے۔ عقد کے بعد وہ بیوی ہو جاتی ہے۔ لیکن بیوی بنتی برسوں میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو انتظار گوارا نہ ہوا۔ انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اگر بیوی میں ایک عیب ہے تو اور بہت سی خوبیاں ہوں گی۔ وہ رشتہ کی بہن ہے، خوب صورت ہے، محبت کرنے والی ہے۔ افسوس صد افسوس! مردوں کے عیب کھولنا منع ہے۔ لیکن شاید مردوں کو اللہ عقل دے۔ ڈاکٹر مرحوم کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں نہیں تھیں، جو حضورؐ نے میاں بیوی کے نباہ کے بارے میں فرمائیں۔ کاش کہ ایسا ہوتا تو ڈاکٹر مرحوم میں یہ نزاکت مزاج نہ پیدا

ہوتی۔ نہ وہ جلدی بازی سے کام لیتے۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ یہ ان کی ایک غلطی تھی، جس کا خمیازہ ایک کمزور جان کو بھگتنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے۔

ممانی صاحبہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئیں۔ تکیہ پر سے تولیہ اٹھایا اور چہرے پر اس طرح پھیرا جیسے پسینہ پونچھ رہی ہوں۔ میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے سوال کیا۔

میں: اور دوسری بیوی؟

ممانی صاحبہ: دوسری بیوی میں کئی خامیاں تھیں۔ انھوں نے جدید طرز تعلیم سے ڈگری تو حاصل کی تھی، لیکن تعلیم کے اصل مقصد سے دور تھیں۔ ان کی تعلیم کا حاصل صرف یہ تھا کہ وہ اپنے جسم کو مختلف طریقوں سے سنوار کر اپنے کو خوب صورت پیش کر سکتی تھیں۔ لیکن رشو! محض خوب صورتی نباہ کا سبب تو نہیں ہوتی۔ کچھ دن تو منظور نظر بنی رہیں۔ غور سے سن لو، اگر بیوی حور کے مانند ہو، لیکن اگر شوہر کے مذاق کو نہ سمجھ سکے، شوہر کی آمدنی سے زیادہ خرچ کرے تو وہ کبھی اچھی بیوی نہ بن سکے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تعلیم یافتہ بیوی ڈاکٹر مرحوم کے پیشے میں معاون بنی۔ لیکن اپنے کو سنوارنے اور خوب صورت تر بنانے میں اندھا دھند پیسہ پھونکا۔ ابتدا میں تو ڈاکٹر صاحب نے ڈھیل دی۔ لیکن کہاں تک برداشت کرتے۔ بالآخر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی زمانے میں ایک حادثہ ڈاکٹر صاحب کے لیے بہانہ بنا۔ ہوا یہ کہ ایک دن ایک نوجوان زخمی حالت میں ان کے مطب میں لایا گیا۔ وہ درخت سے گر پڑا تھا، عورت بہر حال عورت ہوتی ہے رقیق القلب۔ جس وقت ڈاکٹر صاحب اس نوجوان کا ہاتھ کاٹ رہے تھے بیوی کی زبان سے نکل گیا، کیا خوب صورت اور تندرست جوان ہے۔ بے چارہ لولا ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے مڑ کر بیوی کی طرف دیکھا۔ مریض کو یونہی چھوڑ دیا۔ گھنٹہ بھر میں زہر باد اس کے جسم میں پھیل گیا اور وہ مر گیا۔

اسی دن ڈاکٹر صاحب نے بیوی کو طلاق دے دی۔ پچاس ہزار روپیہ کا مہر تھا۔ عدالت سے اس کی قسط مقرر ہو گئی، جس کی ادائیگی تیرہ چودہ برس تک ہوتی رہی۔

میں لرز گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ممانی صاحبہ کی حالت بھی عجیب تھی۔ کہنے لگیں۔

یہ جو کچھ ہو رہا تھا میں سب سن رہی تھی۔ لوگ یعنی لڑکیوں والے ان سے بدظن ہو گئے تھے۔ اور انھیں شکی اور وحشی قرار دے رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن مجھ پر دورہ پڑا۔ میرے جبڑے بیٹھ گئے تھے اور میں بے ہوش تھی۔ ابا حضور گھبرا گئے۔ ان کو بلا لائے۔ انھوں نے آکر دیکھا، حال پوچھا۔ کہنے لگے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔ یہ کہہ کر انجکشن لگایا۔ کوئی تیز دوا سنگھائی، اور میرے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ بیٹھے۔ نسخہ لکھنے لگے۔ نسخہ لکھ کر چلے گئے۔

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے ابا حضور کو میری شادی کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ بات یہ بھی کہ میری عمر ستائیس سال کی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ پختہ عمر کو پہنچنے پر اگر شادی نہ ہو تو ہسٹریا، درد گردہ، اماس اور ایسے ہی دوسرے مرض لاحق ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر جو دورہ پڑا تھا اسے انھوں نے ہسٹریا کی ابتدائی شکل بتائی تھی۔ میں جیسی ہوں تم دیکھتی ہو، نہ گورے بدن کی، نہ چٹے چہرے کی۔ پھر یہ کہ ابا حضور مذہب کے پورے پابند۔ انھوں نے مجھے خود ہی تعلیم دی اور گھر ہی میں میری تربیت ہوئی۔ کیا سمجھیں تم۔ یعنی میں آج کل کے معنی میں تعلیم یافتہ نہ تھی۔ امی جان نے گھر داری سکھا دی تھی۔ سینا پرونا اور کاڑھنا آ گیا تھا اور اب میں ہی گھر کو سنبھالے ہوئے تھی۔ لیکن میرے لیے جو پیغامات آتے وہ ابا حضور کو نہ جچتے۔ اسی لیت ولعل میں میری عمر ستائیس سال کی ہو گئی۔ میں دیکھتی تھی کہ امی جان کبھی کبھی ابا حضور سے جھگڑنے لگتی تھیں۔

پھر ایک دن ابا حضور نے امی جان سے کچھ باتیں کیں۔ اور اچانک مجھے مخاطب کر کے کہا۔ بیٹی ڈاکٹر صاحب نے پیغام بھیجا ہے۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر میری تعلیم و تربیت جدید طرز پر ہوئی ہوتی تو میں صاف انکار کر دیتی۔ ایسے شکی مزاج اور وحشی کو کون عورت پسند کر سکتی ہے۔ مگر میں کچھ نہ بول سکی۔ ابا حضور نے امی جان سے کہا کہ پوچھنا کیا رائے ہے؟ ابا حضور کی عدم موجودگی میں امی جان نے پوچھا تو میں...... تو میں...... اچھا رشو! اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کہتیں؟ (اچانک ممانی صاحبہ نے مجھ سے سوال کر دیا)۔

میں: یہی کہ ماں باپ جہاں چاہیں کر دیں۔ (اور یہ کہہ کر میں مسکرا دی)

ممانی صاحبہ: ہاں یہی میں نے کہہ دیا اور منھ لپیٹ کر اپنے پلنگ پر جا گری۔ لو دن

تاریخ مقرر ہوا۔ نکاح ہوا۔ مہر دس ہزار کا طے ہوا۔ وہ ڈاکٹر صاحب نے نقد ادا کر دیا۔

جس وقت میں گھر سے چلی ہوں۔ کیا بتاؤں رشو! میرے رشتے داروں اور سہیلیوں کا کیا حال تھا۔ سب کا خیال تھا کہ یہ دلہن ابھاگن بن کر ڈاکٹر وحشی کے گھر سے آجائے گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے آخری دم تک ان کی بیوی بنی رہی۔

میں: آپ نے بیوی کا کردار کیسے ادا کیا؟

ممانی صاحبہ: سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب کی ضروریات نوٹ کر لیں۔ پھر اپنے نوٹس پر عمل کر کے مہینہ بھر کے اندر ہی ان کو مطب جانے کے لیے ٹھیک وقت پر فارغ کر دینے میں کامیاب ہو گئی۔ میں صبح سویرے اللہ کی بندگی سے فارغ ہو کر ان کو سلام کرتی تھی۔ مجھے یہ یقین تھا کہ سلام کا رواج دینے سے محبت بڑھتی ہے۔ میں خوب صورت تو تھی نہیں۔ شکل وصورت کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مجھے بے عیب کہا جا سکتا تھا۔

میں: بے عیب! ممانی جان بے عیب تو اللہ.........

ممانی صاحبہ: میرا مطلب یہ ہے کہ بس زیادہ سے زیادہ گوارا کیا جا سکتا تھا۔ بھلا سانولی صورت والی سے کوئی حسین شوہر کیوں محبت کرنے لگا۔ اور پھر وہ جو جدید تعلیم سے کوری بھی ہو۔ میں نے ''سلام'' کا سہارا پکڑا۔ اللہ کا شکر ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے میری شادی کے چالیسویں دن جب ڈاکٹر صاحب مطب جانے لگے تو بڑی متانت سے انھوں نے بھی ''السلام علیکم'' کہا، اور میں نے اسی سنجیدگی کے ساتھ وعلیکم السلام۔

میں: جب وہ مطب چلے جاتے تو آپ کیا کرتی تھیں؟

ممانی صاحبہ: تم نے کیوں سوال کر دیا۔ میں خود بتاتی۔ ان کے جانے کے بعد میں ان کے کپڑوں کو روز دیکھتی تھی۔ دھونے کے لائق کپڑے الگ کرتی۔ مرمت کے لائق کپڑے الگ اور جن کپڑوں کو دھوپ میں ڈالنا ہوتا ان کو دھوپ میں ڈال کر مرمت کے لائق کپڑوں کو درست کرتی۔

باورچی خانے کے انتظام میں میں نے بوا پر بھروسہ کبھی نہیں کیا۔ خود اپنی نگرانی میں کھانا تیار کراتی۔ ڈاکٹر صاحب کے ذوق کو سمجھ لیا تھا۔ جب تک اس ذوق کے مطابق نہ ہوتا میں کوشش کرتی رہتی۔ بارہ بجے وہ آجاتے، ہم ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ کھانا کھا کر وہ آرام کرنے چلے جاتے۔ پھر میں ان سے نہ بولتی۔ میں بھی آرام کرتی۔ ڈیڑھ بجے میں ظہر کی نماز پڑھتی۔ تلاوت قرآن کا

وقت میں نے یہی رکھا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت میری طرف آتے۔ لیکن مجھے مصروف دیکھ کر چلے جاتے۔

ایک دن میں نے محسوس کیا تو ان سے پوچھا۔ ’’شاید اسی وقت آپ کو کوئی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ آپ بہت مہذب آدمی ہیں اس لیے میرا لحاظ کر کے واپس ہو جاتے ہیں۔

میرے اس انداز تخاطب سے وہ مسکرائے۔ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے، کہنے لگے اس میں کیا لکھا ہے۔ میں نے کہا ’’میں نے تو سنا ہے کہ آپ نے مکتب میں پہلے اس کی تعلیم پائی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ میں آپ سے زیادہ اس کا علم نہیں رکھتی۔‘‘

کہنے لگے۔ میں نے ناظرہ پڑھا تھا۔ پھر عربی کے طریقۂ تعلیم کے ناقص ہونے کی وجہ سے طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ اور دوسری طرف مڑ گیا۔

’’تو میں آپ کے لیے ترجمہ کا بہترین قرآن پیش کر سکتی ہوں۔‘‘ اور یہ کہہ کر ترجمہ والا جو قرآن میں نے ان کے لیے منتخب کیا تھا۔ اور وہ اسی دن کے لیے میرے پاس رکھا تھا نکالا اور انھیں دے دیا۔

خدا جانے کیا بات تھی۔ میں نے انھیں قرآن دیا تو ان کا ہاتھ کانپنے لگا۔ اگر میں ان کے ہاتھ سے قرآن نہ لے لیتی تو شاید بے ادبی ہو جاتی۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ رات کو قرآن کا مطالعہ کرنے لگے۔ قرآن کے مطالعہ سے وہ ’’شوہر‘‘ بننے لگے۔

ممانی صاحبہ مسکرادیں۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا ’’اقبال! تم بڑی خوب صورت ہو۔‘‘

میں: خوب صورت! (میں ممانی جان کی صورت دیکھنے لگی)۔

ممانی صاحبہ: میں بھی اسی طرح حیران ہو کر انھیں دیکھنے لگی تھی۔ انہوں نے کہا بے شک تم خوب صورت ہو۔ خوب صورتی کا تعلق عورت کی کھال سے نہیں بلکہ حقیقت حال سے ہے۔ خوب صورت بیوی عورت کے جسم کے اندر ہوتی ہے۔ وہ تم میں ہے

میں: یہ سن کر آپ تو بہت............

ممانی صاحبہ: ہاں مجھے خوشی ہوئی۔ اور اس دن میری سمجھ میں آیا کہ مرد کیا چاہتا ہے۔ خلاصہ غور سے سنو، مرد عورت سے اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہے۔ یہی بات انھوں نے مجھ سے کہی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ عورت کی تخلیق اللہ نے اسی غرض کے لیے کی تھی۔ انھوں نے اقرار کیا اور اس دن مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے قرآن کا گہرا مطالعہ کر کے میرے سامنے یہ بات کہی۔

رشو بی! دوسری بات شوہر چاہتا ہے کہ وہ گھر کے نظم ونسق سے ایسا فارغ ہو جائے کہ پوری توجہ اپنے کام میں صرف کر سکے۔ جو عورتیں شوہر کے سامنے گھر کی الجھنیں رکھتی ہیں وہ سخت غلطی کرتی ہیں۔ میں نے اپنے شوہر کو کبھی گھر کی الجھن میں مبتلا نہیں کیا۔ اس سے ان کی قوت کار بڑھ گئی۔

تیسری بات یہ کہ پڑھا لکھا شوہر مہذب گفتگو کو بہت پسند کرتا ہے۔ میں نے غیر مہذب گفتگو نہ ان سے کی اور نہ ان کے رشتے داروں سے۔ ان کے دوستوں کی خاطر ومدارات تو جیسا چاہیے کرتی رہی۔ لیکن غیر سنجیدہ بات سے ہمیشہ پرہیز کیا۔

ایک دن وہ خود کہنے لگے۔ ''اقبال تمہارے والدین نے تمہاری بڑی اچھی تربیت کی۔

یہ سن کر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر ان کے دل کو جیت کر میں ان کے گھر کی رانی بن گئی۔ اب وہ بات بات پر میری طرف دیکھتے اور جو میں چاہتی وہ ہوتا۔ اور پھر تم جانتی ہو ہماری زندگی کیسی اچھی بسر ہوئی۔ میں نے اپنے بچوں کو جس راستہ پر ڈالا اس میں ڈاکٹر صاحب ذرا بھی مخل نہیں ہوئے۔ جہاں چاہا بچوں کی شادیاں کیں۔ اور جو چاہا خرچ کیا۔ جانتی ہو نا!

میں: ہاں جانتی ہوں۔

ممانی صاحبہ خاموش ہو گئیں۔ میں نے پھر مزید کرید نہیں کی۔ میرا مطلب پورا ہو چکا تھا۔